اقبالؒ

ایک سیاستدان

محمد صدیق قریشی

قطار اپلیکیشنز نیا محلہ روڈ جہلم

اقبال ایک سیاستدان

محمدؐ صدیق قریشی

قنطار پبلیکیشنز نیا محلہ روڈ جہلم

اِنتِسَاب

اُستادِ محترم

جناب ڈاکٹر مُنیر الدین چُغتائی

——— کے نام

فہرس

		صفحہ
باب اول :-	فلسفۂ تعلیم	۵
باب دوم :-	حریم وطن سے حریم بشریت تک	۲۵
باب سوم :-	کوچۂ سیاست میں	۷۳

بار اوّل تعداد ۱۰۰۰ طابع وناشر: صفیہ بانو

مطبوعہ: خیابان پریس لاہور کتابت: قاری حبیب احمد جہلم

آغازِ سخن

شیلے کے الفاظ میں شاعری کوئی ربانی چیز ہے۔ علم و حکمت کا مرکز بھی ہے اور محیط بھی"۔ مغرب کے ایک دوسرے انشاء پرداز کی رائے ہے کہ "میرے نزدیک شاعر ایک سیاستدان بھی ہے اور حکیم بھی، مقنن بھی اور فلسفی بھی ہے۔"

ان آراء کے معیار پر کھنے سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت علامہ حقیقی معنوں میں شاعر تھے۔ "شاعری جزو لیست از پیغمبری" کے آئینہ میں وہ بلند خیال مفکر۔ وسیع النظر حکیم اور ایک دور بین سیاستدان تھے۔ یاس و قنوطیت کے عہد میں ان کی شاعری درسِ عمل کا درجہ رکھتی تھی۔ اُن کا پیغام ایک دعوتِ عمل اور قومی درد کے مترادف تھا۔ مشہور انشاء پرداز قاضی عبدالغفار نے حضرت علامہ کے پیام پر ان الفاظ میں اظہار کیا ہے۔ "مجھے اقبالؒ کے سرودِ مستانہ کے جس تار کی آواز سب سے زیادہ بھلی معلوم ہوتی ہے۔ اس کا کچھ حال مجھ سے سُن لیجئے۔ اقبالؒ کی شاعری تغزل بھی ہے، ترنم بھی ہے، شوکتِ الفاظ بھی رکھتی ہے۔ اس میں داغ کی زبان بھی ہے غالب کا فلسفہ بھی ہے، شبلی و حالی کی قومیات بھی، سب کچھ ہے جو کچھ ہونا چاہیئے لیکن اس سب کچھ کے اندر جو ایک پیام عمل ہے، جو فلسفۂ حیات ہے، جو دعوتِ جد و جہد ہے، جو جستجو و آرزو ہے، وہی اس سب کچھ کی جان ہے۔ ملت کے وجودِ اجتماعی میں شاعر کا وجود سراپا پیام عمل نہ ہو تو کچھ بھی نہیں"

حضرت علامہ کے کلام میں حافظ کا سوز، عمر خیام کی رندی و بے باکی، غالب کی خودداری و مشکل پسندی، اکبر کا طنز، حالی کا جذبہ قومی، شکسپیئر کی فطرت نگاری، ملٹن کی پروازِ فکر اور گوئٹے کی حکمت شعاری موجود تھی۔ وہ مستقبل کے شاعر تھے، جیسا کہ وہ خود فرماتے تھے ؎

نغمہ ام از زخمہ بے پرواستم　　من نوائے شاعر فرداستم

وہ سیاس خشک نہیں تھے بلکہ نہایت ذکی الحس شاعر تھے۔ ان کے کلام سے مقصدیت کے رنگا رنگ پھول کھلے خودی، عشق، فقر اور آزادی کے مرکزی موضوعات پر ہی ان کے فلسفہ کی دیواریں اُٹھتی ہیں۔ انہوں نے ایک باعمل انسان کی طرح اتنا کچھ کیا کہ ایک زوال پذیر قوم سے اجتماعی طور پر بھی اس کا عشرِ عشیر ناممکن تھا۔

کارلائل کے الفاظ میں بحیثیت شاعر وہ ہیرو ہیں۔ یونان کی عظمت ہومر کی تصنیفات کے سہارے بچی اور فردوسی نے ایرانی ہیروز کے سنہری کارناموں کو لافانی بنا دیا ہے۔ حضرت علامہ نے دنیائے مسلم کو اس کی بدبختی سے آگاہ کیا۔ اس جلیل القدر ہستی کی اَن گنت مذہبی، سیاسی اور وطنی خدمات ہیں کہ اُن سے لمحہ بھر کے لئے بھی اغماض نہیں کیا جاسکتا۔ عہدِ حاضر کے فقید المثال مفکّر کے قلم کی ضیاپاشی سے اسلامیان عالم کی بے عمل زندگی اور بے حس رُوح میں ایک انقلابِ عظیم پیدا ہوا

حضرتِ علامہ نے بالکل ٹھیک وقت پر نظریۂ پاکستان پیش کیا کہ آزاد اسلامی ریاست کا قیام ہی مسلمانوں کی جدوجہد کا مقصود ہوسکتا ہے۔ ایسے وقت میں جب کہ ان کے تدبّر و حکمت اور اُن کی قیادت و سیادت کی قوم کو سخت ضرورت تھی، وہ ہم سے رخصت ہوگئے۔ اس مقام پر پہنچنے کے بعد اس افتخارِ مشرق و مغرب کے مشن کو کامیاب بنانے کے لئے ایک ایسے میرِ کارواں کی ضرورت تھی، جس کی نگاہ بلند، جاں پُرسوز اور سخن دلنواز ہو اور وہ ملّت کے کارواں کو اس کی منزل پر پہنچائے۔ یہ ہماری خوش بختی تھی کہ اُمید عمل کے پیامبر کو محمد علی جناحؒ کی صورت میں یہ میرِ کارواں بھی مِل گیا۔ اور حضرت علامہ نے قائدِ اعظمؒ کو ملّت کی کشتی سنبھالنے کے لئے آمادہ کرلیا۔

میری یہ حقیر سی کاوش بخدمت علامہ مرحوم ایک نذرانۂ عقیدت ہے۔ بارگاہِ الٰہی میں دُعاگو ہوں کہ ہم میں وہی گرمیٔ گفتار و کردار پیدا ہو جس کے حضرت علامہ متمنی تھے

ع ایں دُعا از من و از جملہ جہاں امین باد

آخر میں، میں پروفیسر باغ حسین کمالؔ، پروفیسر خالد حمید، پروفیسر محمد ممتاز قریشی اور شیخ نور الٰہی کی عملی ہمدردیوں کے لئے تہِ دل سے اُن کا ممنون ہوں۔

محمد صدیق قریشی

یکم اکتوبر ۱۹۷۷ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

بابِ اوّل

فلسفۂ تعلیم

تعلیم سے عام طور پر "پڑھنا اور لکھنا" مراد لیا جاتا ہے، حالانکہ یہ ایک بہت وسیع اصطلاح ہے یہ اپنے دامن میں بے شمار تجربات اور مشاہدات کو سموئے ہوئے ہے، تعلیم یافتہ فرد اچھائی اور بُرائی میں تمیز پیدا کرتا ہے، جبکہ اَن پڑھ شخص کا ذہن غور و فکر اور تحقیق و تجربے سے عاری ہوتا ہے اسی لئے ارسطو نے کسی کے دریافت کرنے پر۔ کہ تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ میں کیا فرق ہے، یہ کہا تھا کہ۔ "جتنا فرق ایک زندہ اور مُردہ انسان میں ہوتا ہے"

حضرت علامہ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اُنہوں نے برّصغیر کے مسلمانوں کو بالعموم اور انگریزی خوان طبقہ کو بالخصوص مغرب کی ذہنی غلامی سے نجات دلائی۔ انہوں نے یہ کوشش کی کہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد یہ لازمی ہے کہ عوام میں اخلاقی نظم و ضبط پیدا ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ان میں آزادانہ غور و فکر کی صلاحیت بھی پیدا ہو۔ اُن کو ایک بڑی شکایت جدید تعلیم یافتہ طبقے سے تھی کیونکہ یہ لوگ اپنے ملّی افکار تہذیب و روایات کو کمتر سمجھتے تھے۔ وہ شک و ریب کا شکار ہو گئے تھے۔ حضرت علامہ کا یہ پختہ یقین تھا کہ جب تک مسلمانوں کو ذہنی غلامی کے اس نشیب سے نہیں نکالا جائے گا اور اُن میں یہ احساس پیدا نہیں کیا جائے گا کہ وہ ہیرے جواہرات کو پھینک کر مغرب کے سنگریزوں کو جمع کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں وہ اس ذہنی غلامی کی زنجیریں کبھی نہیں کاٹیں گے اور نہ ہی وہ حقیقی آزادی سے ہمکنار ہو سکیں گے۔

اس مقصد کے حصول کے لئے اس شاعرِ فردا نے اپنی سوز و گداز میں ڈوبی ہوئی شاعری کے علاوہ مختلف اوقات میں کی گئیں تقاریر کا سہارا لیا۔ رُبع صدی تک

اُنہوں نے اپنی نظموں، نثر اور تحریر و تقریر کے ذریعے ذہنی انقلاب برپا کرنے کے لئے جہاد کیا۔ جناب کے جی سیّدین نے ایک خط میں حضرت علاّمہ سے یہ استفسار کیا تھا کہ وہ علم جو صرف ذہن کی مدد سے حاصل کیا جائے اور وہ علم جو وجدان کے ذریعہ سیکھا جائے، اُن دونوں میں کیا رشتہ ہوگا؟ اُن کے جواب میں حضرت علامہ نے فرمایا تھا۔[1]

"علم سے میری مُراد وہ علم ہے جس کا دارد مدار حواس پر ہے۔ عام طور پر میں نے علم کا لفظ ان ہی معنوں میں استعمال کیا ہے، اس علم سے ایک طبعی قوت ہاتھ آتی ہے جس کو دین کے ماتحت رہنا چاہیئے۔ اگر دین کے ماتحت نہ رہے تو محض شیطنت ہے۔ یہ علمِ علمِ حق کی ابتدا ہے جیسا کہ میں نے جاوید نامہ میں لکھا ہے"

علمِ حق اوّل حواس آخر حضور
آخرا دمی نگنجد در شعور

وہ علم جو شعور میں نہیں سما سکتا اور جو علم حق کی آخری منزل ہے اُس کا دوسرا نام عشق ہے۔ علم و عشق کے تعلق میں جاوید نامہ میں کئی اشعار ہیں۔

علمِ بے عشق است از طاغوتیاں
علمِ با عشق است از لاہوتیاں

مُسلمانوں کے لئے لازم ہے کہ علم کو (یعنی اُس علم کو جس کا مدار حواس پر ہے اور جس سے بے پناہ قوت پیدا ہوتی ہے) مسلمان کرے "بولہب را حیدر کرّار کُن"، اگر بولہب حیدر کرّار بن جائے یا یوں کہیئے کہ اگر اس کی قوت دین کے تابع ہو جائے تو نوع انسان کے لئے سراسر رحمت ہے۔"

حضرت علاّمہ کے نزدیک ایک ایسا نظام تعلیم رواج دینا چاہیئے جو فرد کی تمام اعلیٰ صلاحیتوں کو بروئے کار لانے میں ممد ثابت ہو سکے، اور انسان کو نہ صرف مادی اعتبار سے مضبوط و مستحکم بنائے بلکہ اسے روحانی غذا بھی بہم پہنچائے۔ وہ سمجھتے

---

[1] Saiyidayan, K.G; Iqbal's Educational Philosophy (Lahore. Mohammad Ashraf, 1945) p. 110.

تھے کہ علم صرف علمِ عقل ہی کا نام نہیں بلکہ علم کے حصول کا ایک دوسرا ذریعہ وجدان ہے جس کی مرکزی قوت عشق سے پیدا ہوتی ہے۔ وہ عقل کی اہمیت تسلیم کرتے ہیں لیکن۔

عقل گو آستاں سے دور نہیں
اس کی تقدیر میں حضور نہیں

اور اسی لئے اُن کا ارشاد ہے ؏

یہ وہ جنت ہے جس میں حُور نہیں

وجدان ایک ایسی طاقت ہے جو ہمہ گیر، جامع اور یقینی ہے۔ عقل جہاں تشکیک کو جنم دیتی وہاں وجدان یقین پیدا کرتا ہے، عقل سوچتی ہی رہتی ہے کہ فلاں کام کرنا چاہیئے یا نہیں، جبکہ وجدان ؎

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

یہی وجہ ہے کہ حضرت علامہ ایک ایسے نظام تعلیم کے خواہاں تھے جو انسان کی خارجی اور داخلی زندگی کی تکمیل کر سکے ان کی نظریں تعلیم کے ہر شعبہ پر مرکوز ہیں وہ مادیت اور روحانیت میں مطابقت دیکھنا چاہتے ہیں کیونکہ اس کے بغیر فلسفہ تعلیم مکمل نہیں ہے۔ اُن کے نزدیک عقلیات پر مبنی تعلیم فسوں و افسانہ سے بڑھ کر نہیں ؎

تب و تابے کہ باشد جاودانہ سمندِ زندگی را تازیانہ
بہ فرزنداں بیاموزاں تب و تاب کتاب و مکتب افسوں و فسانہ!

نری مادیت تو تہذیب و تمدن کی نیستی کا موجب بن سکتی ہے کیونکہ روحانیت اور مادیت میں عدم مطابقت اعلیٰ اقدار سے محرومی کا باعث بنتی ہے اسی لئے وہ مغرب کو متنبہ کرتے ہیں ؎

خبر ملی ہے خُدایانِ بحر و بر سے مجھے
فرنگ رہگزرِ سیلِ بے پناہ میں ہے

پھر فرمایا ؎

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکان نہیں ہے کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا۔

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

علم صحیح معنوں میں صرف اُسی وقت علم کہلوا سکتا ہے جب وہ افراد میں شعورِ ذات اور احترامِ انسانیت پیدا کرے کیونکہ ؎

برتر از گردوں مقامِ آدم است
اصلِ تہذیب احترامِ آدم است

جب علم و فن زندگی کے لئے اسبابِ تحفظ پیدا کرنے لگیں گے تو ؎

علم از سامانِ حفظِ زندگی است علم از اسبابِ تقویمِ خودی است
علم و فن از پیش خیزانِ حیات علم و فن از خانہ سازانِ حیات

حضرت علامہ کے نزدیک ہر چیز قادرِ مطلق کی ملکیت ہے، انسان تو محض امانتدار ہے

اے کہ می گوئی متاعِ ازماست مردِ ناداں ایں ہمہ مُلکِ خداست
ارضِ حق را ارضِ خود دانی بگو چیست شرحِ آیۂ لَا تُفْسِدُوا
کس امانت را بکارِ خود نہ بُرد اے خوش آں کو مُلکِ حق با حق سپرد

حضرت علامہ ایسے دیدۂ بینائے قوم کے فلسفۂ تعلیم میں خودی کی نشوونما ہے۔ یہ لارڈ میکالے کے نظامِ تعلیم سے یکسر مختلف ہے کیونکہ وہ خودی کا زوال اور روحانیت کا زیاں تھا۔

آہ! یہ اہلِ کلیسا کا نظامِ تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف

پھر ارشاد فرمایا ؎

شکایت ہے مجھے یارب خداوندانِ مکتب سے
سبق شاہین بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

جن بچوں نے کل مُلک و ملّت کی باگ ڈور سنبھالنی ہے، اُن کی تربیت تو نہایت ہی اعلیٰ و پاکیزہ اُصولوں پر ہونی چاہیئے۔ اس راز کو حضرت اقبال نے پالیا تھا وہ بچے کی زبان پر یہ دُعا دیکھنا چاہتے تھے ؎

زندگی ہو میری پروانے کی صُورت یارب!
علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یارب!

لیکن حضرت علاّمہ اس کے برعکس حالات دیکھ کر یہ کہہ اُٹھے۔

جوانے خوش گلے رنگیں کلاہے　　نگاہ او چو شیراں بے پناہے
بہ مکتب علم میشی را بیاموخت　　میسر با بدش برگ گیاہے

حضرت علاّمہ کا یہ پختہ یقین تھا کہ ایک نسل کی اچھی تربیت کے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ اچھے اساتذہ پیدا کئے جائیں۔ شاگرد اُستاد کا پرتو ہوتا ہے۔ اس لئے یہ لازمی ہے کہ معاشرے میں اُستاد کو جائز مقام دلوایا جائے کیونکہ ؎

شیخ مکتب ہے اک عمارت گر　　جس کی صنعت ہے رُوح انسانی
نکتۂ دل پذیر تیرے لئے　　کہہ گیا ہے حکیم قاآنی
پیشِ خورشید برتمش دیوار　　خواہی از صحنِ خانہ نورانی

اسی طرح ؎

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیلؑ کو آدابِ فرزندی

اُستاد اور شاگرد کے درمیان ایک دائمی رشتہ ہوتا ہے، یہ اُستاد ہی ہوتا ہے جو انسان کو احسن تقویم کے مقام سے سرفراز کراتا ہے، ایک اچھے اُستاد کے زیرِ سایہ تربیت پاکر طالب علم خود دار، خود کوش اور اکلِ حلال کا جویا بن سکتا ہے، وہ یہ سبق سیکھتا ہے کہ وہ خود اپنا رہبر ہے ؎

خُدایا وقتِ آں درویش خوش باد　　کہ دلہا از دمشق چوں غنچہ بکشاد
بہ طفلِ مکتبِ ما ایں دُعا گفت　　پئے نانے بہ بندِ کس میفتاد!

تعلیم کا مقصدِ عظیم یہ ہے کہ انسان خلعتِ مردانگی پہن کر میدانِ فرزانگی میں آئے خردمند کار موقع شناس اور معاملہ فہم بنے اور عاداتِ نامعقول سے پرہیز کرے یہ پُرانی کہاوت ہے کہ علم دولت سے بہتر ہے۔ سڈنی اسمتھ نے اسی لئے تو کہا تھا کہ "علم کو تادم مرگ عزیز رکھو یعنی عزیز رکھو معصومیت کو، عزیز رکھو چال چلن کی درستی کو، عزیز رکھو اس شئے کو جو دولت مند ہونے کی صورت میں تمہاری دولت کو لوگوں کی نظروں میں عزیز، غریب ہونے کی صورت میں تمہاری غریبی کو معزز بنا دے گی اور ان لوگوں کو تم پر ہنسنے سے روکے گی جن کے سینے نخوت و تکبّر سے معمور ہیں۔

عزیز رکھو، اس شئے کو جو تمہیں تسلّی دے گی، تمہیں زینت بخشے گی۔"

تعلیم کا یہ مقصد ایک ایسے اُستاد کی موجودگی میں ہی حاصل ہو سکتا ہے جس کا دل صاف و پُر سوز ہو، اُس کی بات دل نشیں ہو۔ اُس کا یہی کمال ہے کہ وہ خود اپنی نگاہوں سے پوشیدہ ہونے کے علی الرغم دُنیا کی نظروں میں آشکارا ہوتا ہے ؎

سر منبر کلامش نیشدا راست
کہ اُو را صد کتاب اندر کنار است
حضور تو من از خجلت نگفتم
ز خود پنہاں و بر ما آشکار است

تعلیم پر عمل نہ کرنے والے پارس پتھر کی مانند ہوتے ہیں، جو اوروں کو تو سونا بناتا ہے مگر خود پتھر کا پتھر ہی رہتا ہے۔ حضرت علامہ ایک ہونہار شاگرد تھے اور اُن کو اچھے اُستادوں کی صحبت بھی میسّر آئی۔ وہ جب کبھی سیالکوٹ تشریف لے جاتے تو اپنے اُستاد مکرم سیّد میر حسن جو اسکاچ مشن کالج میں عربی کے پروفیسر تھے، کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتے اور مختلف اُمور پر اُن سے تبادلۂ خیالات کرتے۔ جب سرکار برطانیہ نے حضرت علاّمہ کو سر کے خطاب سے نوازنا چاہا تو انہوں نے اصرار کیا کہ اُن کے اُستادِ مکرم کو شمس العلماء کا خطاب اُن سے پہلے دیا جائے۔

سیّد میر حسن کی شان میں حضرت علاّمہ کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں ؎

وہ شمعِ بارگہِ خاندانِ مرتضوی — رہے گا مثلِ حرم جس کا آستان مجھ کو
نفس سے جس کے کھلی میری آرزو کی کلی — بنایا جس کی مروت نے نکتہ دان مجھ کو
دُعا یہ کر کہ خداوندِ آسمان و زمین — کرے پھر اسکی زیارت سے شادمان مجھ کو

۲۵ ستمبر ۱۹۲۹ء کو جب سیّد میر حسن نے اس دُنیا سے کوچ کیا تو حضرت علاّمہ نے قرآن مجید کی اس آیت سے تاریخ نکال کر اُن کی قبر پر یہ کتبہ ثبت کرایا۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝

حضرت علاّمہ کے ایک دوسرے اُستاد مسٹر ٹامس آرنلڈ تھے اُن کی انگلستان روانگی کے بعد حضرت اقبال نے اُن کی تصویر دیکھ کر یہ نظم کہی ؎

کھولدے گا دشتِ وحشت عقدۂ تقدیر کو — توڑ کر پہنچوں گا میں پنجاب کی زنجیر کو

دیکھتا ہے دیدۂ حیراں تیری تصویر کو — کیا تسلّی ہو مگر گرویدہ تقدیر کو
تابِ گویائی نہیں رکھتا دہن تصویر کا — خامشی کہتے ہیں جس کو ہے سخن تصویر کا

جو دوستی اور محبت اُستاد اور شاگرد میں پہلے دن سے پیدا ہوئی وہ آخر کار شاگرد کو اُستاد کے پیچھے پیچھے انگلستان لے گئی۔ یہ اُستاد کی عزت ہی تھی جو اُن کو عظیم شخصیّت بنا گئی۔

یہ ہے وہ تصویر جو حضرت علاّمہ کے ذہن میں اُستاد اور شاگرد کی تھی۔ وہ خود اس کا ہو بہو نمونہ تھے۔ حکیم مشرق بخوبی جانتے تھے کہ نوجوان کسی قوم کا گراں مایہ سرمایہ ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے کلام میں جگہ جگہ نوجوانوں کو محنت و مشقت، جرأت و ہمت اور عزم و استقلال کا درس دیا گیا ہے۔ وہ نوجوان نسل کو علم غیر اور فکر غیر کے طلسم سے نکال کر اپنے اسلاف کے کارناموں سے فیضیاب ہونے کی یوں تلقین کرتے ہیں ؎

کبھی اے نوجواں مسلم! تدبّر بھی کیا تُو نے؟ — وہ کیا گردوں تھا، تُو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا؟
تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوشِ محبت میں — کُچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاجِ سرِ دارا
تمدن آفریں، خلّاق آئینِ جہانداری — وہ صحرائے عرب، یعنی شُتر بانوں کا گہوارا
سماں الفقر فخری کا رہا شانِ امارت میں — بآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را

حضرت علاّمہ نوجوانوں کو ایک سچّا اور حقیقت پسند مسلمان دیکھنے کے متمنی تھے۔ وہ نوجوانوں کو شاہین کی فطرت کا ہم راز سمجھتے تھے جو بلندیوں کی طرف پرواز کرتا ہے اور اس کی نگاہوں میں ہمیشہ ہی آسمان کی وسعتیں ہوتی ہیں۔ اُن کا فلسفۂ تعلیم کردار سازی کے محور کے ارد گرد گھومتا ہے ؎

ادب پیرایۂ ناداں و داناست — خوش آں کو از ادب خود را بیاراست
ندارم آں مسلماں زادہ را دوست — کہ در دانش فزود و در ادب کاست!

حضرت علاّمہ کے کلام میں نوجوانوں کو عزم و ہمت، خودداری و استغنا، کوشش و جستجو حوصلہ مندی و استقلال، جد و جہد اور پیہم جوشِ عمل کی تعلیم ملتی ہے ؎

کسے کُو بر خودی زد لا اِلٰہ را — ز خاکِ مردہ روباند نگہ را
مدہ از دست دامانِ چنیں مرد — کہ دیدم در کمندش مہر و مہ را

حکیم الامت کو چونکہ صوفیائے کرام، مشائخ عظام، بزرگانِ دین اور اسلام کے نامور سپہ سالاروں سے نہایت گہری محبت اور عقیدت تھی۔ حکیم سنائیؒ، حضرت مجدد سرہندیؒ اور حضرت محبوب الٰہیؒ کے مزاراتِ مقدسہ پر آپ نے جس چاہت و محبت اور احترام و عقیدت کے تحت حاضری دی۔ ان کا تذکرہ شاعر مشرق کی تصنیفات میں موجود و محفوظ ہے۔ انہوں نے ان بزرگوں کی تعلیمات سے خود استفادہ کرنے کے علاوہ مسلمانوں تک پہنچایا۔ ان کے کلام میں حضرت جلال الدین رومیؒ کی تعلیمات اور اُن سے محبت و چاہت کے تذکرے بھرے پڑے ہیں، وہ کبھی تو اس پیغام کو عظیم المرتبت سپاہی ٹیپو سلطان شہید کی زبان میں ادا کرتے ہیں اور کبھی خوشحال خان خٹکؒ کی زبانی اس تعلیم کو ہم تک پہنچاتے ہیں۔

حضرت اقبال یہ چاہتے تھے کہ صاحب کردار اور صاحب گفتار بننے کے لئے یہ ضروری ہے کہ بچے اپنی عمر کے ابتدائی سالوں سے ہی قومی اور ملّی وقار کا تحفظ کرنا سیکھیں اور اپنے جذبات و احساسات اور مقاصد حیات میں ہم آہنگی پیدا کریں اس کے لئے اُن میں جذبۂ قربانی بدرجۂ اتم موجود ہونا چاہیئے ؎

بے معجزہ دُنیا میں اُبھرتی نہیں قومیں
جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہُنر کیا

جناب محمد احمد صدیقی نے حضرت علامہ کی تعلیمات کی روشنی میں درجِ ذیل اوصاف برائے تعمیرِ حیات گنوائے ہیں[۱]۔

(۱) جہاں گیری (عالم آب و گل پر غلبہ و تصرف)
(۲) جہانداری (حکومت و سلطنت)
(۳) جہانبانی (عالم کاخ و کو کی بنیاد مستحکم کرنا)
(۴) جہاں آرائی (عالم شش جہات کو زیب و زیبائش دینا)

مغرب میں تعلیم کا عمل حرفِ آخر نہیں بلکہ حرفِ آغاز سکھاتا ہے لیکن کردار سازی میں ممد و معاون ثابت نہیں ہوتا۔ وہاں بہتر زندگی کا دارومدار تمام تر دولت

---

[۱]:۔ اقبال کے تعلیمی نظریات ص ۱۰۸، محمد احمد صدیقی، اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ کراچی ۱۹۶۵ء

کی فراوانی پر ہے۔ لیکن یہ رجحان درست نہیں، اسی رجحان کو حضرت علامہ محو کرنا چاہتے تھے اور علم حاصل کرکے باعمل بننے کی تلقین کرتے تھے۔ وہ عمل کے لئے ایمان اور یقین کے داعی ہیں، کیونکہ یقین سے ہی فلاح و کامیابی حاصل ہو سکتی ہے

خدائے لم یزل کا دست قدرت تُو، زباں تُو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تُو ہے

یقین کی کارفرمائی پر حضرت علامہ کو اس قدر بھروسہ ہے کہ ؎

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پر رُوح الامیں پیدا

حکیم الامت کے نزدیک مقاصد کا تعین اور اُن کے حصُول کے لئے تگ و دو ہی زندگی کا حقیقی عمل ہے۔ لیکن اس تخلیق کا اعلیٰ مقصد صرف اُسی جذبہ سے ہی ممکن ہے جب نظامِ تعلیم میں روحانی اور مادی اقدار کا امتزاج پایا جائے۔ اس امتزاج کی بدولت یقین کی دولت بھی پیدا ہو گی اور یقین ہی وہ شمشیر براں ہے جو غلامی کی زنجیروں کو کاٹ کے رکھ دیتی ہے۔ ؎

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

پھر فرمایا: ؎

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

اسی ضمن میں یہ شعر ملاحظہ فرمائیں:۔

یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملت ہے
یہی قوت ہے جو صورت گرِ تقدیرِ ملت ہے

حضرت علامہ کی یہ خواہش تھی کہ نظامِ تعلیم کی بنیادیں دین و دانش، عقل و وجدان اور دل و نظر پر ہونی چاہئیں۔ طالب علم کے پیشِ نظر دُنیا اور عقبیٰ دونوں کی بہتری ہونی چاہیئے ؎

بہ پورِ خویش دینی و دانش آموز کہ تابد چوں مہ و انجم نگینش
بدستِ او اگر دادی ہُنر را یدِ بیضا است اندر آستینش!

اس صفت سے نوازے جانے کے بعد خود شناسی کا عمل شروع ہو گا

اور پھر ؎

نوا پیدا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنّم سے
کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا

نہ صرف یہ بلکہ ؎

ضمیرِ لالہ میں روشن چراغ آرزو کر دے
چمن کے ذرّے ذرّے کو شہیدِ جستجو کر دے

حضرت علامہ نے قوم کی اجتماعی کردار سازی پر خصوصی توجہ فرمائی ہے۔ انہوں نے اپنے وجدان سے اس حقیقت کو پا لیا کہ افراد کی لغزشیں تو معاف ہو سکتی ہیں لیکن من حیث القوم خطائیں اور گناہ قابلِ تعزیر ہوتے ہیں اور قدرت کبھی درگزر نہیں کرتی ؎

فطرت افراد سے اغماض تو کر لیتی ہے
نہیں کرتی مگر ملّت کے گناہوں کو معاف

اس لئے اتحاد و عمل اور یکجہتی کی اشد ضرورت ہے کیونکہ ؎

یہی آئینِ فطرت ہے، یہی اسلوبِ فطرت ہے
جو ہے راہِ عمل میں گامزن، محبوبِ فطرت ہے

حکیم الاُمت نے تعلیمِ نسواں پر بھی اپنے زریں خیالات کا اظہار فرمایا۔ وہ اس مسئلہ میں دوسرے فلسفیوں اور شعراء سے مختلف نکتہ نظر رکھتے تھے۔ نطشے کا کہنا تھا کہ ــــ "تم عورت کے پاس جا رہے ہو، اپنا ہنٹر نہ بھول جانا"، شیکسپیئر نے تو عورت کو پیدائشی مکّار ٹھہرایا۔ حضرت علامہ کو حقوقِ نسواں سے بڑی دلچسپی تھی۔ فرزند اسلام ہونے کے ناطے اُن کے پیشِ نظر تاریخ اسلام اور اس کی تعلیمات تھیں۔ وہ جانتے تھے کہ جب فاطمۃ الزہراؓ رسالتِ مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آتی تھیں تو وہ تعظیماً کھڑے ہو جایا کرتے تھے۔ حضرت علامہ اسرارِ خودی میں عورت اور اس کی اہمیت کو سیر حاصل طریقے سے اپنے اشعار کی زینت بناتے ہیں۔ اُن کی نظر میں فاطمۃ الزہراؓ مسلم خواتین کے لئے تین اسباب پر ایک

تحریک ہیں۔

(۱) پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی۔

(۲) علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ، کی اہلیہ محترمہ۔

(۳) حسنؓ اور حسینؓ کی والدہ ماجدہ۔

اسلام نے عورت کو معاشی اعتبار سے حق میراث عطا کیا ہے اور اُسے مہر حاصل کرنے کے علاوہ اپنی ذاتی جائیداد رکھنے کی اجازت بھی مرحمت فرمائی ہے۔ وہ اپنے کسی بھی تنازعے کے حل کے لئے عدالت سے رُجوع کر سکتی ہے۔ حضرت علامہ بھی عورت کو وہی مقام دلانا چاہتے ہیں جو اسلام نے اُسے بخشا۔ عورت کی اہمیت وہ ان اشعار میں بیان کرتے ہیں ؎

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ — اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں
شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشتِ خاک اس کی — کہ ہر شرف ہے اُسی دُرج کا دُرِ مکنون
مکالماتِ فلاطون نہ لکھ سکی لیکن — اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرارِ افلاطون

حکیم الاُمت صنفِ نازک کی تعریف اس جذبے کے تحت کرتے ہیں ؎

نگاہِ تست شمشیرِ خدا داد — بزخمش جانِ ما را حق بما داد
دل کامل عیارِ آں پاک جاں برد — کہ تیغِ خویش را آب از حیا داد

حضرت علامہ کے نزدیک عورت استحکام عالم کی ضامن ہے وہ اُسے "امینِ ممکنات" کے لقب سے پکارتے ہیں۔ اُن کو بخوبی علم ہے کہ قول نپولین بونا پارٹ "مجھے اچھی مائیں دو، میں تمہیں اچھی قوم دوں گا" بالکل درست ہے

جہاں را محکمی از اُمہات است — نہادِ شاں امینِ ممکنات است
اگر ایں نکتہ را قومے نداند — نظامِ کار و بارش بے ثبات است

حضرت علامہ خواتین کو خاتونِ جنت کی سیرت کا نمونہ دیکھنا چاہتے تھے ؎

بتولےؓ باش و پنہاں شو ازیں عصر
کہ در آغوش شبیرؓ بگیری

شاعرِ مشرق کا خیال تھا کہ مغرب میں جو آزادئ نسواں نظر آتی ہے وہ قرونِ جہالت میں کم تر حیثیت کا ردِ عمل ہے، مردوں کے مساوی حقوق مانگتے وقت وہ فطری حقوق

کی حدود سے تجاوز کرنے لگتی ہیں۔ اس طرح وہ اپنے حقیقی فرائض سے چشم پوشی کی بھی مرتکب ہوئی ہیں یعنی بچوں کی نگہداشت اور پرورش کو بھول گئی ہیں۔
جدید عورت کے رُجحانات یورپ میں دورِ حاضر کے معاشی خلل پیدا کرنے کے بڑی حد تک ذمہ دار ہیں۔

حضرت علامہ آزادیٔ نسواں کے خواہاں تھے لیکن وہ موجودہ تعلیم نسواں کے نقائص اور تہذیب حاضرہ کے نتائج سے بھی بخوبی آگاہ تھے ؎

تہذیبِ فرنگی ہے اگر مرگِ امومت — ہے حضرتِ انساں کے لئے اسکا ثمر موت
جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن — کہتے ہیں اس علم کو اربابِ نظر موت
بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسۂ زن — ہے عشق و محبت کے لئے علم و ہنر موت

شاعرِ مشرق آزادیٔ نسواں کو بُرا نہیں سمجھتے ؎

کیا چیز ہے آرائش و قیمت میں زیادہ
آزادیٔ نسواں کہ زمرّد کا گلوبند

پھر فرمایا ؎

نَے پردہ نہ تعلیم نئی ہو کہ پُرانی
نسوانیتِ زن کا نگہباں ہے فقط مرد

جس قوم نے اس زندہ حقیقت کو نہ پایا — اس قوم کا خورشید بہت جلد ہوا زرد

حکیم مشرق اس بات کے تہ دل سے خواہاں تھے کہ وہ مذہبی تعلیم سے نوازی جائے

کوئی پوچھے حکیم یورپ سے — ہند و یوناں ہیں جس کے حلقہ بگوش
کیا یہی ہے معاشرت کا کمال — مرد بے کار و زن تہی آغوش

وہ عورت کو نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

فطرت تو جذبہا دارد بلند — چشم ہوش از اسوۂ زہرا بلند
تا سینے شاخ تو بار آورد — موسم پیش بہ گلزار آورد

کیونکہ عورت کو ان صفات سے ہمکنار کرنا پوری قوم کو باوصف بنانے کے مترادف ہے

ایں گل از بستان نارستہ بہ
داغش از دامانِ ملت نشستہ بہ

حضرتِ اقبالؒ ایک ایسے نظامِ تعلیم کے خواہشمند تھے جو روحانی وجسمانی ہر لحاظ سے آزادی پسند ہو۔ آزادیٔ افکار اور آزادیٔ گفتار کے بغیر نہ آزادیٔ عمل رہتی ہے اور نہ ہی ارتقاء ممکن ہے ؎

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی

اپنی ایک دوسری نظم بعنوان "پند باز با بچۂ خویش" میں انہوں نے ان اوصاف کی توضیح ان الفاظ میں کی ہے ؎

تو دانی کہ بازاں زیک جوہر اند | دلِ شیر دارند دمشتِ پرند
نکو شیوہ وپختہ تدبیر باش | جسود وغیور و کلاں گیر باش
چہ قومے فرومایۂ ترسناک! | کند پاک منقار خود را بخاک!
نگہ دار خود را و خورسند زی | دلیر و درشت و تنومند زی
زروئے زمیں دانہ چیدن خطاست | کہ پہنائے گردوں خدا داد است
ز دستِ کسے لقمۂ خود مگیر | نکو باش و پند نکو یاں پذیر

تعلیم حاصل کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ زیادہ علم کی بدولت انسان زیادہ دولت حاصل کر سکے۔ لہٰذا تعلیم حاصل کرنے کا مقصد صرف ذرائع روزگار سے ہمکنار ہونا ہی نہیں بلکہ اپنے اور بنی نوعِ انسان کے لئے بہتر زندگی کی نئی نئی راہیں تلاش کرنا ہے۔ حضرتِ علامہ کی رائے میں نظامِ تعلیم میں اتنے زیادہ نقائص پائے جاتے ہیں کہ اس نے ہمارے نوجوانوں سے ان کا ذوقِ نوا سنجی چھین لیا ہے۔ ان میں ندرتِ فن ہو گئی ہے ؎

نوا از سینۂ مرغِ چمن برد | زخونِ لالہ آں سوزِ کہن برد
بایں مکتب ایں دانش چہ نازی | کہ ناں در کف نداد و جاں زتن برد!

اسی ندرتِ فکر و عمل کے ذریعہ اصلاحِ ذات، تعمیرِ خودی اور تسخیرِ کائنات ہی ممکن ہو سکتی ہے ؎

ندرتِ فکر و عمل کیا شئے ہے ذوقِ انقلاب | ندرتِ فکر و عمل کیا شئے ہے ملّت کا شباب
ندرتِ فکر و عمل سے ہے معجزاتِ زندگی | ندرتِ فکر و عمل سے سنگِ خارہ لعلِ ناب

حضرت علامہ کے فلسفہ تعلیم میں آرٹ اور ادب کو ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ اُن کے نزدیک ادب زندگی کا ایک لازمی جزو ہے۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ یہ تخلیقی اور ارتقاء پذیر ہو ورنہ یہ محض نوائے غم اور مُردنی کا علمبردار ہوگا، اس لئے ؎

شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا

ادب انسان کے فکر و عمل کو جِلا بخشتا ہے اور قوموں کی برادری میں اُس قوم کا مقام بلند ہوتا ہے ؎

قوموں کی حیات ان کے تخیل پہ ہے موقوف
یہ ذوق سکھاتا ہے ادب مُرغِ چمن کو

مجذوب فرنگی نے بانداز فرنگی
مہدی کے تخیل سے کیا زندہ وطن کو

اے وہ کہ تو مہدی کے تخیل سے ہے بیزار
نومید نہ کر آہوئے مشکیں سے ختن کو

اچھے ادب کی تخلیق عشق اور علم دونوں کو حرکت میں لانے کا ضامن ہوتی ہے۔

خودی ہو علم سے محکم تو غیرتِ جبریل
اگر ہو عشق سے محکم تو صورِ اسرافیل!

علم را مقصود اگر باشد نظر
می شود ہم جادہ و ہم راہبر!

علم تفسیر جہانِ رنگ و بُو
دیدۂ و دل پرورش گیرد از و!

بر مقام جذب و شوق آرد ترا
باز چوں جبریل بگذارد ترا

عشق کس را کے بخلوت می برد
اُو ز چشم خویش غیرت می برد!

اولِ اُو ہم رفیق و ہم طریق
آخر اُو راہ رفتن بے رفیق!

حضرتِ اقبال یہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کے زوال کا ایک اہم سبب سائنسی علوم اور سائنٹیفک نظریہ کا فقدان ہے۔ وہ شدت سے یہ محسوس کرتے تھے کہ مسلمان عصرِ حاضر کی ترقی سے صرف اُسی صورت میں ہمکنار ہو سکتے ہیں جب وہ اس کی تلافی کریں۔ لیکن اس سے اِسے مغربی سرمایہ داری کی راہ پر نہیں چل نکلنا چاہیئے ورنہ ؎

نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب و رنگ
خواجگی نے خوب چُن چُن کر بنائے مسکرات

حکیم الامت یہ جانتے تھے کہ سکون و قلب کو مذہب کے دامن میں تلاش کیا جا سکتا ہے جو مکمل صداقت کا دعویدار ہے، لیکن یہاں قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ حضرت علامہ کی مذہبیت

میں عام فرقہ پرستی نہ تھی بلکہ وہ ایک مسلسل روحانیت اور وحدانیت کی کھوج کا دوسرا نام ہے

نہیں فردوس مقام بدل وقال واقول — بحث وتکرار اس اللہ کے بندے کی سرشت
ہے بدآموزی اقوام و ملل کام اس کا — اور جنت میں نہ مسجد، نہ کلیسا، نہ کنشت

پھر ارشاد ہوا ؎

کیا صوفی و مُلّا کو خبر مرے جنوں کی
ان کا سر دامن ابھی چاک نہیں

حضرت علّامہ روایتی قسم کے پرستار نہ تھے، یہ جذبہ کبھی طنز اور کبھی مزاح کی صورت میں نمایاں ہوتا تھا ؏

یہ الٰہیات کے ترشے ہوئے لات و منات

ایسے جذبے کی مثال ایک اور دوسرے شعر میں بھی ملتی ہے ؎

تمدن، تصوف، شریعت کلام
بُتانِ عجم کے پجاری تمام

حضرت اقبالؒ مذہبی تعلیم کی تدریس کے ساتھ ساتھ یہ چاہتے تھے کہ اسے عصرِ حاضر کے تمام جدید تقاضوں سے آراستہ کیا جائے۔ مرکزی اہمیّت مذہب کو ہی حاصل رہے لیکن اس کے اردگرد زندگی کے معاشرتی، معاشی، سیاسی، سائنسی، فلسفیانہ اور بین الاقوامی دوائر کو گھومنا چاہیئے۔ پھر جو نتائج پیدا ہوں گے اُن کو علامہ مرحوم نے ان اشعار میں بیان کیا ہے ؎

یا وُسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل — یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست — یہ مذہبِ مُلّا و جمادات و نباتات

مذہب اور علوم جدیدہ کے امتزاج سے بین الاقوامی وسعت نظر پیدا ہوگی۔ مذہب کا کام بنیادی خطوط کی نشاندہی کرنا ہے۔ یہ آدابِ بندگی اور زندگی سکھاتا ہے اور اس طرح انسان رعونت سے اجتناب کرتا ہے۔ مذہب کی تعلیمات اُسے پالنے سے ہی سیکھ کر آنی چاہئیں وہ مذہب کی تعلیمات سے آراستہ ہو کر زماں و مکاں کی حقیقتوں کو پالے گا ؎

شاید کرہ زمیں ہے یہ کسی اور جہاں کی — تُو جس کو سمجھتا ہے فلک اپنے جہاں کا!

مذہب انسان کو فنا فی الذات کا درس نہیں دیتا بلکہ اخوت اور ایثار کا درس دیتا ہے اس کی سچی تعلیمات پر گامزن ہو کر کمالِ انسانیت حاصل ہو سکتا ہے ؎

ہے سلسلہ احوال کا ہر لحظہ دگرگوں
اے سالکِ رہ فکر نہ کر سود و زیاں کا

پھر فرمایا ؎

اگرچہ زر بھی جہاں میں ہے قاضی الحاجات
جو فقر سے ہے میسر تونگری سے نہیں!

اسی رموزِ حیات کو ایک اور شعر میں بیان کیا ؎

اگر جہاں میں مرا جوہر آشکار ہوا
قلندری سے ہوا ہے، تونگری سے نہیں

دینی اور دُنیاوی علوم میں امتزاج اور ہم آہنگی پیدا کرنے کے بعد انسان اپنی منزل کو نہیں پہنچ جاتا، اُس کا فرض ہے کہ وہ مسلسل اجتہاد کرتا رہے اس طرح ارتقا کا عمل جاری رہے گا اور اسی ضمن میں حضرت علامہ نے فرمایا ؎

یہ ہیں سب ایک ہی سالک کی جستجو کے مقام
وہ جس کی شان میں آیا ہے علّم الاسماءَ

لیکن ایمان کا یہ درجہ فکر و عمل کے ذریعہ ہی مستحکم ہوتا ہے ؎

مقامِ ذکر کمالاتِ رومیؔ و عطارؔ | مقامِ فکر مقالاتِ بوعلی سینا!
مقامِ فکر ہے پیمائشِ زمان و مکاں | مقامِ ذکر ہے سُبحان ربیّ الاعلیٰ!

مفکرِ اسلامؒ ایک ایسا بامقصد نظامِ تعلیم چاہتے ہیں جو انسان کو یہ سمجھنے میں مدد دے کہ وہ خود کیا ہے اور اس کی ہستی اس کائنات میں کیا مقام رکھتی ہے؟ یہ انسان کی، قدرت کی طرف سے ودیعت کردہ، صلاحیتوں کو اُجاگر کرے اور اس کی جلالی اور جمالی قوتوں کے صحیح توازن قائم کرنے میں مدد دے۔ انسان اتنا عالمِ باعمل ہو جائے کہ وہ باطل نظامِ حیات کی جگہ آوازۂ حق لے سکے۔ یہ نکتہ توحید کو سمجھ کر ہی ذہن نشین ہو سکتا ہے اور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ بابرکت کی سُنت کو نمونہ بنا کر ہی زندگی کی اس معراج کو حاصل کیا جا سکتا ہے۔

آہ! اس راز سے واقف ہے نہ ملّا، نہ فقیہہ
وحدتِ افکار کی بے وحدتِ کردار ہے خام!

لیکن اس راہ پر گامزن ہو تو پھر:

قبضہ میں یہ تلوار بھی آجائے تو مومن
یا خالدِؓ جانباز ہے یا حیدرِؓ کرارؓ

اور یہ قوّت جس نوعیت کی حامل ہوگی اُسے درج ذیل شعر سے بیان فرمایا:۔

لا دیں ہو تو ہے زہر ہلاہل سے بھی بڑھ کر
ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاق

حضرت علاّمہ کے اس نظامِ تعلیم سے فیضیاب ہو کر ایک ایسا انسان کامل پیدا ہوگا جو صوفیوں، نطشے اور فطشے کے انسان کامل سے قطعی مختلف ہوگا۔ وہ زندگی کی کُلّیت اور حیات کی بلندیوں کا پیکر ہوگا اور پھر یہی انسان فخریہ کہے گا۔

تری نگاہ میں ہے معجزات کی دُنیا — مری نگاہ میں ہے حادثات کی دُنیا
تخیلات کی دنیا غریب ہے لیکن — غریب تر ہے حیات و ممات کی دُنیا
عجب نہیں کہ بدل دے اُسے نگاہ تری — بُلا رہی ہے تجھے ممکنات کی دُنیا

اور پھر:۔

نو شب آفریدی چراغ آفریدم — سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی — خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم — من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

ایسا انسان رازدانِ فطرت ہو جائے گا اور وہ حجابات عالم کے پس پردہ چشمِ عریاں سے دیکھ سکے گا ؎

قدرت کے مقاصد کا عیار اُس کے ارادے — دُنیا میں بھی میزان، قیامت میں بھی میزان
فطرت کا سرودِ ازلی اس کے شب و روز — آہنگ میں یکتا صفتِ سورۂ رحمٰن!

اور یہی نہیں بلکہ اس مکتبِ علم سے بہرہ ور ہونے والا بجا طور دنیا میں اپنی حکمرانی کا سکّہ بٹھائے گا اور فخریہ نیابتِ الٰہی کی ذمہ داریاں قبول کرے گا۔

نائب حق دو جہاں بودن خوش است بر عناصر حکمراں بودن خوش است
نائبِ حق ہمچو جانِ عالم است ہستیٔ او ظلِّ اسمِ اعظم است

مشرق کے اس مفکرِ اعظم نے اپنے عرصۂ رکنیت پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے دوران میں بھی ایک اعلیٰ و ارفع نظامِ تعلیم کے موضوع پر مختلف اوقات میں اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔ ۱۰ مارچ ۱۹۲۷ء کو تعلیم کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا[۱]

"اس ملک میں غیر ملکی حکومت لوگوں کو جاہل رکھنا چاہتی ہے۔ ایک غیر ملکی حکومت ایک قسم کا رومن کیتھولک چرچ ہے جو اُن تمام وسیلوں کو دبانا چاہتا ہے جو ملک کو منور کرنا چاہتے ہیں۔ کیا اس ایوان کے اندر اور باہر کوئی شخص انکار کر سکتا ہے کہ عوام الناس کی تعلیم لوگوں کے مفادات کے لئے قطعی طور پر لازمی نہیں ہے ۔۔۔ اس لئے میری گذارش یہ ہے کہ جہاں تک پرائمری تعلیم کا تعلق ہے یہ صوبے کے مفادات میں قطعی طور پر ضروری ہے اور اسے فوری طور پر لازمی اصول کے تحت رائج کیا جائے۔"

حضرت علامہ نے پنجاب کے تعلیمی نظام کی طرف خصوصی توجہ دی۔ ایوان کے اندر گرماگرم بحث کے دوران میں وہ بے چین ہو جاتے تھے کیونکہ ۱۹۲۰ء تک پنجاب کی ۲-۳/۸ ملین آبادی میں سے صرف ۴ء۲ فیصد لوگ تعلیم حاصل کر رہے تھے۔

اُن کی ان کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات کے تحت وزیر تعلیم سر فضل حسین نے تعلیمی سہولتیں بہم پہنچانے کا سلسلہ شروع کیا۔ ۱۹۱۹ء کے لازمی تعلیم کے ایکٹ کو جزوی طور پر نافذ کیا گیا اور ۱۹۲۶ء تک طلباء کی تعداد کل آبادی کا ۶ء۱ فی صد ہو گئی اور ۱۹۲۶ء تک بارہ انٹرمیڈیٹ کالج قائم ہو چکے تھے

حضرتِ اقبالؒ نے نجی اسکولوں کو حکومت کی طرف سے امداد کی حکمت عملی پر بھی تنقید کی۔ حکومت نجی اسکولوں کی درجہ بندی اُن کی مالی حیثیت کے مطابق کرتی تھی۔ جو زیادہ

---

[۱] Vahid, S.A; Thoughts and Reflections of Iqbal (Mohammad Ashraf, Lahore. 1964) p. 313.

خرچ کرتے، وہ زیادہ امداد حاصل کرتے تھے۔ اس نظام کی رُو سے میونسپل اور نجی ادارے اپنے اخراجات کے پچاس سے نوّے فی صد کی امداد حاصل کرتے۔ اگرچہ صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت تھی لیکن معاشی اعتبار سے اُن کا کوئی مقام نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم ادارے ہندوؤں کے اداروں کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے۔

۴ مارچ ۱۹۲۹ء کو حضرت علامہ نے پنجاب لیجسلٹو کونسل میں ۱۹۲۹ء — ۱۹۳۰ء کے بجٹ پر تقریر کرتے ہوئے مختلف نجی اسکولوں کو دی جانے والی امداد کا جائزہ لیا اور اُن کی ضروریات اور امداد میں تفاوت کا ذکر کیا۔ ۱۹۲۲ سے ۱۹۲۳ء کے درمیان پچپن نئے اسکولوں کو امداد دی گئی، جن میں صرف سولہ اسکول مسلمانوں کے تھے۔ ۹۰۶، ۱۲۱ روپوں میں صرف ۲۱۴، ۲۹ روپے مسلم اداروں کو بطور امداد دیئے گئے اسی طرح ۱۹۲۶ — ۱۹۲۷ء میں ۲۸۷، ۱۲۲ روپے امداد دی گئی۔ اس رقم میں سے ۲۱۴، ۲۹ روپے (یعنی کُل رقم کا ۲۳ فی صد) مسلم اداروں کو دیئے گئے ۱۹۲۷ — ۱۹۲۸ء میں ۱۵۴، ۱۳، ۱ روپے امداد دی گئی جبکہ اس رقم میں سے ۳۳۰، ۴، ۲۰ روپے مسلم اداروں نے وصول کئے۔ اپنی ۷ مارچ ۱۹۳۰ء کی بجٹ تقریر میں حضرت علامہ نے یہ انکشاف کیا کہ ۱۹۲۸ء — ۱۹۲۹ء کے دوران میں کل ۲۱ اسکولوں نے امداد حاصل کی۔ ان میں سے ۱۳ ہندوؤں، ۶ سکھوں اور ۲ مسلمانوں کے اسکول تھے ہندو اسکولوں کو ۹۷۳، ۱۶ روپے، سکھ اسکولوں کو ۹۰۸، ۹ روپے اور مسلم اسکولوں کو ۲۲۰۰ روپے دیئے گئے۔

حضرت علامہ نے اس تفاوت پر سخت احتجاج کیا۔ وہ چاہتے تھے کہ حکومت مساویانہ طور پر اس امداد کو تقسیم کرے، خاص کر ان جگہوں میں جہاں لوگ پسماندہ ہیں اور اتنے غریب ہیں کہ وہ تعلیم کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے۔[1]

حضرت علامہ کے تعلیمی نظریات سے اندرون اور بیرونِ ہند لوگ متاثر ہوئے

Shamloo (Latif Ahmed Sherwani), Speeches and Statem
of Iqbal (Lahore, Al-Manar Academy, 1948) pp. 83, 89.,
Vahid, S.A. Thoughts and Reflections of Iqbal, pp. 334

انہی میں ایک افغانستان کے فرمانروا محمد نادر شاہ تھے جنہوں نے حضرت علامہ، سیّد سلیمان ندوی اور سر راس مسعود کو دورۂ کابل کی دعوت دی۔ نادر شاہ ان حضرات سے نئی یونیورسٹی کے قیام کے سلسلہ میں اور اعلیٰ تعلیم کی از سرِ نو تنظیم میں روایتی اسلامی اور جدید مغربی اقدار کی روشنی میں مشورہ چاہتے تھے۔ اکتوبر ۱۹۳۳ء میں حضرت علامہ اپنے ساتھی مدعوین کے ہمراہ کابل پہنچے اور وہاں ایک ماہ تک قیام کیا۔

اگر یہ سچ ہے کہ روسو اور والٹیئر نے فرانس کو نئے دور کی نوید سنائی اور نطشے کارل مارکس اور ٹالسٹائی کی تصنیفات نے اُن کے ممالک میں ترقی اور زندگی کے نئے دور کے آغاز میں حصّہ لیا تو حضرت علامہ کی شاعری اور نظریات نے یقیناً مسلم معاشرے میں زبردست تبدیلی پیدا کی ہے۔

باب دوم

حریمِ وطن سے حریمِ بشریت تک

تہذیبی اعتبار سے مسلمانوں کا ہندوؤں سے بدیہی طور پر تشخص متمیز اور منفرد تھا اور دونوں اقوام کے افکار و عقائد اور طرز معاشرت بھی جُدا تھی۔ وہ صدیوں تک اکٹھے رہنے کے باوجود ایک دوسرے میں ضم تو کیا ایک دوسرے کے مماثل نہ ہو سکے ان متوازی معاشروں کے تمکن میں شاید ہندوؤں کا حصہ زیادہ تھا کہ جہاں مسلمان توحیدِ الٰہی کا پرچار کرتے وہاں ہندو گاؤ ماتا کی پوجا کرتے اسلام نے رنگ و نسل کی نفی کی جب کہ چھوت چھات ہندو معاشرے کی ایک نمایاں خصوصیت تھی۔ اس طرح اُنہوں نے اپنے تہذیبی تشخص کو حکمرانوں سے الگ تھلگ کر کے محفوظ رکھا یہ سوال پیدا ہونا فطری امر ہے کہ اُنیسویں صدی کے اواخر میں جب انگریزوں نے اصلاحات کے نفاذ کے سلسلے میں آغاز کیا تو ہندو ایکا ایکی ایک متحدہ ہندوستانی قومیت کے داعی کیسے بن گئے؛ یہ امر روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ انگریزوں نے ہندوؤں کو برصغیر پر راج کرنے کا ایک عجیب تیر بہدف نسخہ عطا کیا تھا۔ وہ نسخہ تھا اکثریتی حکومت کا اُصول، یعنی حکومت اس قوم یا جماعت کی ہو جس کی عددی اکثریت ہو۔ مغربی جمہوریت کے اُصول کے تحت ہندوستان میں ہندو حکومت حاصل کر کے مسلمانوں پر مستقل غلبہ حاصل کر سکتے تھے۔ گویا ایک تیر سے دو شکار کرنے کا منصوبہ بنایا گیا۔ ہندو جاتی کا اقتدار اور مسلمانوں سے انتقام لے کر ماضی کی محرومیوں کے خلا کو پُر کرنا۔ سر سید احمد خانؒ پہلے مسلمان قائد تھے جنہوں نے اکثریتی حکومت کے مضمرات کو بھانپا اور مسلمانوں کی سیاسی قومیت کی داغ بیل ڈالی۔ تاکہ وہ متحدہ ہندوستانی قومیت کی تحویل میں آ کر ہندو اکثریت کی غلامی کی گرفت سے بچیں۔ ۲۸ دسمبر ۱۸۸۷ء کو جب کہ کانگرس کا تیسرا اجلاس مدراس میں ہو رہا تھا سر سید نے لکھنؤ میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے دوسرے اجلاس میں پہلی دفعہ کانگرس کے خلاف ایک نہایت مفصل تقریر کی اور اکثریتی حکومت کی خرابیاں گنوائیں۔

۱۹۰۵ء سے قبل حضرت علامہ بھی قوم پرست تھے اور یہ محبت حُب الوطنی سے بڑھ کر وطن پرستی کی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔ پرانے دیوتاؤں کی پوجا کو باطل قرار دینے والے علامہ خود وطن کے بہت بڑے بُت کی پوجا میں مصروف تھے۔ اُنہیں وطن کی ہر چیز سے پوجا کی حد تک محبت تھی اس زمانے کی اُن کی نظمیں "ہمالہ" اور "ترانۂ ہندی" اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہیں جن میں وہ مادرِ وطن کی تعریف میں رطب اللسان ہیں ؎

امتحانِ دیدۂ ظاہر میں کوہستان ہے تُو
پاسبان اپنا ہے تُو، دیوارِ ہندوستان ہے تُو

حضرت علامہ بہت بڑے مصوّرِ فطرت تھے، ترانۂ ہندی میں وہ وطن کو ایک خوبصورت گلستان سے تشبیہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بُلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

حضرت علامہ وطن کو نشانِ وحدت خیال کرتے تھے اور کسی قسم کے معاشرتی مذہبی اور فرقہ وارانہ اختلاف میں یقین نہیں رکھتے تھے اُن کا خیال تھا کہ مذہب اختلافات کا سبق نہیں دیتا۔ ہم ہندوستانی ہیں اور ہندوستان کی فلاح و بہبود ہمارا طُرّۂ امتیاز ہے ؎

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بَیر رکھنا
ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستاں ہمارا

"نیا شوالہ" میں وہ ہندو مسلم اتحاد کے لئے کوشاں نظر آتے ہیں اور دونوں اقوام کو مادرِ وطن کی اساس پر ایک قومیت کے رشتے میں باندھنا چاہتے ہیں۔ اس مقصد (باہمی محبت، یگانگت اور باہمی امداد) کے لئے اُن کے پاس جو فارمولا ہے وہ یہ ہے کہ ہندو اور مسلمان ایک ہی دیوی یعنی ہندوستان کی پوجا کریں ؎

ہندوستاں لکھ دیں ماتھے پہ اس صنم کے
بھُولے ہوئے ترانے دُنیا کو پھر سُنا دیں

پھر فرمایا:۔

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستان والو
تمہاری داستان تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں

ایک اور مقام پر یوں مخاطب ہوئے :۔

آ غیرت کے پردے اکبار پھر اٹھا دیں　بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقشِ دوئی مٹا دیں
سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی　آ اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں

لیکن حضرتِ اقبال کے ہم وطن خوابِ خرگوش میں محو رہے، نقار خانے میں طوطی کی آواز آئی اور نکل گئی۔ ان تمام ناکامیوں کے باوجود وہ مایوس نہیں ہوئے بلکہ ان بکھرے ہوئے دانوں کو ایک ہی تسبیح میں پروتے پر کمر بستہ رہے۔ ع

دکھاؤں گا میں اے ہندوستان رنگِ وفا سب کو
کہ اپنی زندگی کو تجھ پر قربان کر کے چھوڑوں گا

اُس دور میں حضرت اقبال کا یہ خیال تھا کہ مذہب تمام تنازعات اور اختلافات کا سبب ہے لیکن اس کے برعکس وطن نشانِ وحدت ہے اس کے نزدیک نفاق کا سبب جو یقیناً عارضی ہے غیر حکومت کا وجود ہے وہ وطن کو اغیار کے پنجے میں دیکھ کر کڑھتے اس لئے باہمی محبت اور وحدت اور بھی ناگزیر ہو جاتی ہے ؎

محبت ہی سے پائی ہے شفا بیمار قوموں نے
کیا ہے اپنے بختِ خفتہ کو بیدار قوموں نے

یہ خیال کہ حضرت علامہ نے بعد میں وطن کی محبت سے کنارہ کشی کر لی تارِ عنکبوت سے زیادہ وزن نہیں رکھتا۔ ضرب کلیم میں "گلہ" نامی ایک چھوٹی سی نظم میں وہ یوں مخاطب ہیں ؎

معلوم کسے ہند کی تقدیر کہ اب تک　بیچارہ کسی تاج کا تابندہ نگیں ہے
دہقان ہے کسی قبر کا اُگلا ہوا مُردہ　بوسیدہ کفن جس کا ابھی زیرِ زمیں ہے
جاں بھی گروِ غیر، بدن بھی گروِ غیر　افسوس کہ باقی نہ مکاں ہے نہ مکیں ہے
یورپ کی غلامی پہ رضا مند ہوا تو　مجھ کو تو گلہ تجھ سے ہے یورپ سے نہیں

پھر ارشاد ہوا :۔

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تیری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

آخر مجبور ہو کر وہ یہاں تک کہہ گزرتے ہیں ؎

لیکن مجھے پیدا کیا اس دیس میں تو نے
جس دیس کے بندے ہیں غلامی پہ رضامند

وطن کی محبت کے جذبہ میں سرشار حضرت اقبال وطن سے غداری کو سب سے بڑا گناہ سمجھتے ہیں ؎

جعفر از بنگال و صادق از دکن !
ننگِ آدم، ننگِ دیں، ننگِ وطن

غدارِ وطن قابل نفرت ہوتا ہے، اُسے موت کی آغوش میں بھی چین نہیں ملتا موت اسے کہتی ہے ؎

گفت جان سرّے را اسرار من است — حفظِ جان دیدم تن کار من است
جان رشتے گرچہ نہ از رہ باد و جو — اے کہ از من ہدم جاں خواہی برو
ایں کار چنیں کارے نمی آید مرگ — جان غدارے نیاساید ز مرگ

۱۹۰۵ء تک حضرت اقبال بھی ہندو مسلم اتحاد اور ہندی قومیت کے قائل تھے، ان کی اکثر نظمیں ملک گیر شہرت حاصل کر چکی تھیں جن میں وطن پرستی کی چھاپ نمایاں نظر آتی ہے۔ اس سال اُنہوں نے یورپ کا رختِ سفر باندھا، یہ سفر اُن کے لئے وسیلۂ ظفر ثابت ہوا۔ اس سفر نے اُنہیں زندہ و جاوید کر دیا۔ یورپ میں انہوں نے جغرافیائی، نسلی اور لسانی قومیت کے تاریک پہلوؤں کا بغور مطالعہ کیا تو ان پر ہندوؤں کے عزائم کھلے۔ اُن میں مسلم خوابیدہ جاگ اُٹھا۔ اس کیفیت نے ان کی "نوائے عشق سے حریم ذات میں شور" پیدا کر دیا۔ بُت کدہ صفات میں الامان کے غلغلے پیدا ہو گئے۔ اور انہوں نے ببانگ دُہل کہہ دیا کہ انسانیت کی نجات صرف اسلام میں ہے۔ اب انہوں نے اپنے کلام کو وطن پرستی کی بجائے مسلم قومیت کے لئے وقف کر دیا۔ انہوں نے اپنی شاعری سے اسلامی اقدار کو فروغ دیا اور برصغیر کے مسلمانوں کو خود اعتمادی کا نیا جذبہ عطا کیا۔ مولانا عبدالسلام ندوی نے حضرت اقبال کی اس ذہنی تبدیلی کے تین اسباب بیان کئے ہیں۔

اولاً :۔ اقبال کو مغرب میں قومیت کی سچی رُوح کے مطالعہ کا وقت ملا اور وہ

اُس نتیجے پر پہنچے کہ انسانی طبع کی ترقی میں قومیت ہی سب سے بڑی رکاوٹ ہے

ثانیاً:۔ اس سفر سے پہلے وہ مادّہ پرست تھے لیکن بعد میں وہ روحانیت کی طرف مائل ہو گئے۔

ثالثاً:۔ اقبال نے تصوف اور اسلام کا غائر مطالعہ کیا جبکہ وہ قومیت کے عنوان سے بھی کماحقہٗ واقفیت رکھتے تھے۔

یورپ سے واپسی پر حضرت علامہ اس نتیجے پر پہنچے کہ ہندوستان مختلف المِلّ برّاعظم ہے اس لئے اس کے مسائل کا حل مغربی انداز کی جمہوریت نہیں بلکہ ایک ایسا نظامِ سیاست ہے جس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو اپنے اپنے زاویۂ نگاہ کے مطابق زندگی بسر کرنے کا موقع حاصل ہو اور مُلک کے جس حصے میں جس قوم کی اکثریت ہے اس کو وہاں کامل دینی اور معاشرتی ترقی کے مواقع حاصل ہوں کوئی مِلّت، دوسری مِلّت پر ناجائز غلبہ حاصل نہ کر سکے۔

اب حضرت علامہ زندگی کے ایک ارفع نظام کی تلاش میں تھے اس جستجو کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اسلام کی اخلاقی تعلیمات خاص کر توحید سے بڑے متاثر ہوئے۔ انہوں نے یہ راز پا لیا کہ اصلی وحدت فکری اور نظریاتی وحدت ہے اور اس لحاظ سے تمام دنیا کے مسلمان ایک وحدت میں بندھے ہوئے ہیں۔ اس زمانے میں عالمِ اسلام پر کئی مصیبتیں نازل ہوئیں، جنگ ہائے طرابلس و بلقان میں مسلمانوں کے خون کی ارزانی ہوئی ایک دردمند قومی شاعر کی طرح حضرت اقبال نے بھی ان واقعات کا اثر قبول کیا اور لکھا:۔

"یورپ کی ملوکانہ اغراض اس امر کی متقاضی ہیں کہ اسلام کی دینی وحدت پارہ پارہ کرنے کے لئے اس سے بہتر کوئی حربہ نہیں کہ اسلامی ممالک میں فرنگی تظریۂ وطنیت کی اشاعت کی جائے۔ چنانچہ ان لوگوں کی یہ تدبیر جنگ عظیم (اوّل) میں کامیاب ہو گئی۔"

حضرت علامہ نے مسلمانوں کے سامنے اسلامی ملّت کا ایک نیا تصوّر پیش کیا اور یہ تصوّر مشاہدات اور تجربات کا حاصل تھا۔ اقوام کی مثال ایک نومولود بچے کی سی ہے جس کی نگاہِ اولین کا محور اُس کی ماں ہوتی ہے۔ شعور کی حد تک پہنچ کر اس کی نگاہ بھی وسیع تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ بعینہٖ ہر گروہ کی سوچ بھی اپنے علاقہ تک ہی محدود رہتی ہے گروہ بندیوں

سے نکل کر وہ قوم اقوام کی صف میں شامل ہوتی ہے۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ سوچ اس علاقہ یا گروہ تک محدود نہیں ہونی چاہیئے۔

ڈاکٹر ایپڈورلئے کا خیال ہے کہ قوم اور قومیت دونوں ہی لاطینی زبان کے لفظ (NATUS) سے مشتق ہیں بمعنی پیدائش۔ کئی جرمن مصنفین لفظ قوم کا استعمال اس کے حقیقی اور نسلی علم صرف کی رُو سے کرتے ہیں لیکن اس کا انگریزی میں صحیح نعم البدل قومیت ہے جبکہ جرمن میں اس کا صحیح نعم البدل (VOLK) ہے جسے انگریزی میں لوگ یعنی (PEOPLE) کہتے ہیں انگریزی میں اس کا استعمال زیادہ تر سیاسی ہے جبکہ جرمن میں اس کا استعمال صحیح سائنٹیفک ہے۔

ای بارکر نے اپنی کتاب "معاشرتی اور سیاسی نظریئے کے اُصول"۔ میں قوم کی تعریف اس طرح کی ہے:۔ قوم اُن لوگوں کا اجتماع ہوتا ہے جو ایک واضح علاقے پر آباد ہوتے ہیں۔ ایک مشترک علاقے پر قابض ہو کر اکٹھے رہنا ہی اُنہیں قوم بناتا ہے اُن کا تعلق کئی نسلوں سے ہوتا ہے اور ان کے آباؤ اجداد بھی مختلف ہوتے ہیں۔ وہ گھومتے پھرتے اس علاقے میں آنکلے، یہ علاقہ اُن کو لُبھایا اور وہ یہیں پر آباد ہو گئے کافی عرصہ تک اکٹھے رہنے سے اُن میں دو طرح کی ذہنی ہمدردی پیدا ہو گئی۔ پہلی ذہنی ہمدردی خیالات و احساسات کا وہ سرمایہ ہے جو مشترک ماضی کے دوران میں جمع ہوا۔ اور نسلاً بعد نسل منتقل ہوتا چلا گیا۔ مشترکہ سرمائے یا روایات میں مشترکہ زبان مشترکہ مذہب (جس کی کئی اشکال ہو سکتی ہیں) اور مشترکہ ثقافت جس کا اظہار مصوری تعمیر، ادب، معاشرتی عادات یا دیگر طریقوں سے ہوتا ہے۔ دوسری ذہنی ہمدردی مستقبل میں آزادانہ اور خود مختارانہ اجتماعی زندگی بسر کرنے کی مشترکہ اُمنگ ہے پس جو لوگ مشترکہ خیالات اور احساسات رکھتے ہیں اُنہیں سیاسی حق ارادیت کے استعمال کا حق بھی حاصل ہوتا ہے۔"

قومیت ایک ذہنی کیفیت کا نام ہے یا اسے نفسیاتی تصور کہہ لیجئے۔ فرانسیسی انقلاب کے بعد جن دو نظریات نے تیزی سے فروغ پایا وہ جمہوریت اور قومیت کے نظریات ہیں۔ برطانیہ وہ پہلا ملک ہے جہاں قومیت نے ایک منظم طریق سے نشوونما پائی ہے۔ پندرہویں صدی کے اوائل میں برطانیہ کی فرانس پر

قبضے کی زبردست کوشش نے اس مُلک میں قومیت کے تصوّر کو بیدار کیا۔ بعد میں کئی دوسرے ممالک میں بھی قومیت کے جذبات بیدار ہونے لگے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج ہر ریاست کی بنیاد قومیت کے اُصول پر رکھی گئی ہے۔

اس جذبہ کی بنیاد بقول ایم رینان دو باتوں پر ہے :۔

"ان میں سے ایک کو ہم ماضی میں تلاش کر سکتے ہیں جبکہ دوسری ہمیں حال ہی میں نظر آتی ہے۔ ایک تو اعلیٰ یادداشتوں کا مشترکہ سرمایہ ہے جبکہ دوسرا مِل جُل کر رہنے اور مشترکہ وراثت سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھانے کی منشا کا بھی حقیقی معاہدہ ہے ..... ماضی کی عظمتوں کا برابر فائدہ اُٹھانا اور ماضی کی مشترکہ منشاء کا فائدہ مِل جُل کر عظیم کارنامے سرانجام دینا اور مزید سرانجام دینے کی اُمنگ رکھنا۔ یہ تمام باتیں انسانوں کے وجود کی لازمی شرائط ہیں"

گویا انسانوں میں نسل، زبان، روایات، ثقافت، مذہب، جغرافیائی حالات تاریخ، حکومت اور مقاصد کا اشتراک وحدت پیدا کرتا ہے۔ یہ اشتراک بقول پروفیسر ہیرلڈ جے لاسکی۔ "اس وحدت میں شریک لوگوں کو باقی نسل انسانی سے الگ الگ اور نمایاں کر کے دکھاتا ہے"، عصرِ حاضر کے مشہور فلسفی برٹرینڈ رسل کا کہنا ہے کہ ــــ

"ہر قوم میں قومیت کا وجود کچھ تو اس کی اپنی قومی عظمت پر یقین اور کچھ اخلاقی قوا علہ پر ہوتا ہے جن کے متعلق یہ خیال ہے کہ وہ ان عقائد کی وجہ سے ظہور پذیر ہوتے ہیں"

علاوہ ازیں وہ لکھتا ہے کہ قوم لازمی طور پر اجتماعی خودستائی اور اپنی ہی قوم کے مفادات کے لئے تگ و دو کرنے کے حق پر یقین پر مشتمل ہے، چاہے اُن کا دوسروں کے ساتھ تصادم ہی کیوں نہ ہو جائے۔ انہی اُلجھاؤ اور پیچیدگیوں کے پیشِ نظر رابندر ناتھ ٹیگور نے اسے تہذیب کے لئے ایک خطرہ قرار دیا ہے۔

قومیت کی ابتداء سے دو اہم نتائج پیدا ہوئے۔ اس نے پُرامن مسلم معاشرے کے سکون میں تلاطم برپا کر دیا۔ اور اقلیتوں کو اکثریت کے استحکام کے خلاف اُکسایا اور غداری، ہوس اور ہر قسم کے مخالفانہ معاشرتی عناصر کو بغاوت پر آمادہ کیا ایسے عناصر عام طور پر تہذیب میں پائے جاتے ہیں۔ تجارتی مراعات کی آڑ میں استحصال کیا گیا اور ایسی سرگرمیوں سے وہ یہاں کی دولت سمیٹ کر اپنے ہم وطنوں کے تعیش

کے لئے لے گئے۔ یہ دولت یورپی اقوام کے اندر معاشرتی تعطل ختم کرنے کے لئے استعمال کی گئی۔ برطانوی نفوذ نے وطنی قومیت، تصوراتی عقلیت اور بے رحمانہ مالی تجارت پرستی ایسے تباہ کن اثرات مرتب کئے جنہوں نے مسلم معاشرے کے روایتی استحکام کی جڑوں کو ہلا کر رکھ دیا۔

پرانی ذاتوں اور جماعتی روایات کو زندگی کا نیا تانا ملا کیونکہ وہاں کے افلاس زدہ عوام کے سامنے صنعتی ترقی کی نئی راہیں کھل چکی تھیں۔ ان ہتھیاروں سے لیس ہو کر انہوں نے مذہبی روایات کا تمسخر اڑایا اور اُن کی جگہ توہمانہ اور فرسودہ عقائد داخلِ زندگی کئے۔ ملحدانہ علم نے آنکھیں کھولیں جس نے نئی نسل کی وفاداری اور تصورات میں ایک ہلچل پیدا کر دی۔

زندگی کے متعلق نئے نظریئے کی کوکھ سے ایک نئی قسم کے معاشی انسان نے جنم لیا۔ جو تنہائی پسند اور ذاتِ حصار کا شکار تھا۔ وہ لکشمی کا پجاری تھا اور اپنی بقا کے لئے نفسیاتی طمانیت اس کا مقصدِ واحد تھا۔ قبائلی اور خاندانی بندھنوں کو وہ صرف آئینہ ایام میں دیکھ سکتا تھا۔ اس کا مذہب مادی علوم کا حصول اور صنعتی یا تجارتی نفع حاصل کرنا تھا۔ اپنی نسل اور مذہب سے ہاتھ دھونے کے بعد اب اس کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہ اپنے تمام جذبات کا محور وطنی قومیت کو بنائے۔ لیکن اس کے نتیجہ میں معرض وجود میں آنے والا 'قومی' معاشرہ نسلی برادری تھی جس کے شہوانی جذبات تھے اور وہ معاشی لالچ کے ملغوبے میں تلاش کی جا سکتی تھی۔

معاشی انسانوں کی یہ نسل ذات پات کے امتیازات کی قیود سے آزاد ہو چکی تھی ذات پات کی جگہ جماعت کی معاشی حیثیت نے لے لی تھی۔ لیکن اوقات تو ذات کی جگہ جماعت کی شکل میں محفوظ کر لی گئی اور ذات کی شناخت کے نقوش مٹانے کے لئے انحراف کو استعمال کیا گیا۔

اس طرح جارح قومیت نے یورپی معاشرے کے سکون کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا کیونکہ یہ ایک جدید تصور ہے جو انسانی اخوت کو تسلیم نہیں کرتا۔ نتیجہ عالمگیر ابتری کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ مغربی نظام کے چار ستون ہیں:-

(۱) لادینیت (۲) انفرادیت (۳) جمہوریت (۴) قومیت۔

مغربی سیاست میں مذہبی عنصر کی عدم موجودگی نے بعض یورپی مدبرین اور سیاستدانوں کو کھلی چھٹی دے دی۔ حضرت علامہ مغربی نظام کو ایک بُرا نظام قرار دیتے ہیں۔ اُن کی اپنی تعلیم مغرب میں پایۂ تکمیل کو پہنچی، اسی لئے وہ مغربی معاشرے کی جزئیات تک سے بخوبی واقف تھے۔ اُن کی تنقید سطحی نہیں تھی اور نہ ہی وہ مغرب کی مکمل طور پر مذمت کرتے ہیں۔ بلکہ وہ مغرب پر تنقید کرتے ہوئے اپنی قوم کی بالواسطہ خدمت کرتے ہیں اور اُسے مغرب کی سطحی چمک سے مرعوب ہونے سے بچاتے ہیں۔ حضرت علامہ فرماتے ہیں[1]

"تاریخ ادیان اس بات کی شاہد عادل ہے کہ قدیم زمانہ میں "دین" قومی ہوتا تھا جیسے مصریوں کا، یونانیوں اور ہندوؤں کا۔ بعد میں "نسلی" قرار پایا جیسے یہودیوں کا۔ مسیحت نے یہ تعلیم دی کہ 'دین' 'انفرادی' اور پرائیویٹ ہے جس سے بدبخت یورپ میں یہ بحث ہوئی کہ دین چونکہ پرائیویٹ عقائد کا نام ہے اس واسطے انسانوں کی اجتماعی زندگی کی ضامن صرف اسٹیٹ (مملکت) ہے۔ یہ اسلام ہی تھا جس نے بنی نوع انسان کو سب سے پہلے یہ پیغام دیا کہ دین نہ قومی ہے، نہ نسلی، نہ انفرادی اور پرائیویٹ ہے، بلکہ خالصتاً انسانی ہے۔ اس کا مقصد باوجود تمام فطری امتیازات کے عالمِ بشریت کو متحد کرنا ہے۔ ایسا دستور العمل قوم اور نسل کی بنیاد پر نہیں بنایا جا سکتا بلکہ صرف معتقدات پر مبنی کیا جا سکتا ہے۔ صرف یہی ایک طریقہ ہے جس سے عالم انسانی کی جذباتی زندگی اور اس کے افکار میں یک جہتی اور ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے جو ایک اُمت کی تشکیل اور اس کی بقا کے لئے ضروری ہے، اس سے علیحدہ رہ کر جو راہ اختیار کی جائے گی وہ شرفِ انسانی کے خلاف ہوگی۔ چنانچہ یورپ کا تجربہ دنیا کے سامنے ہے جب یورپ کی دینی وحدت پارہ پارہ ہوگئی اور یورپ کی اقوام علیحدہ علیحدہ ہوگئیں تو ان کو اس بات کی فکر پیدا ہوئی کہ قومی زندگی کی اساس کیا قرار پائے۔ ظاہر ہے کہ مسیحت ایسی اساس نہ بن سکتی تھی۔ انہوں نے یہ اساس 'وطن' کے تصور میں تلاش کی۔ کیا انجام ہوا، اور

---

[1]:۔ حرف اقبال ص ۲۲۸ مؤلفہ لطیف احمد شیروانی (ایم ثناءاللہ ۲۶ ریلوے روڈ لاہور جنوری ۱۹۵۵ء)

اور ہو رہا ہے، ان کے اس انتخاب کا؟ لوتھر کی اصلاح، غیر سلیم عقلیت کا دور، اصول دین کا، اسٹیٹ کے اصولوں سے افتراق بلکہ جنگ، یہ تمام قوتیں یورپ کو دھکیل کر کس طرف لے گئیں۔ لادینی دہریت اور اقتصادی جنگوں کی طرف۔"

حضرت علامہ قوم اور ملت کے درمیان فرق پیش کرتے ہیں۔ قوم لوگوں کا وہ گروہ ہے جس کی تشکیل قبائل، نسل، زبان یا علاقے کے خطوط پر ہوتی ہے، اس کے برعکس ملت کی اساس اسلامی آئیڈیالوجی پر ہے — ایک ایسی اساس جو تمام تر روحانی ہے اور نتیجتہً خونی رشتہ داری کی نسبت سماوی نوعیت کی حامل ہے۔ اس نے گروہوں کے تنوع کو اپنے اندر جذب کر لیا اور اس جملہ مجموعہ کو ایک واحد قوم میں تبدیل کر دیا۔ جو خود شعوری کی مالک ہے۔ پس مسلم قومیت کی اساس توحید ہے جو اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے اس کے برعکس عیسائیت میں تثلیث کا تصور ہے، عیسائی حضرت یسوع مسیح علیہ السلام کو خدا کا بیٹا قرار دیتے ہیں، مسلمان اس کی نفی کرتے ہیں۔ یہودیت کے پیرو عزیر علیہ السلام کو فرزندِ الٰہی مانتے ہیں جبکہ ہندو عقیدہ حلول کے ماننے والے، اُن کے نزدیک رام یا کرشن، بھگوان کا اوتار ہیں۔ یہ تمام عقائد ایک دوسرے سے متصادم ہیں تو لازمی طور پر یہ تصادم اُن کے پیروؤں میں بھی ہوگا۔ چاہے نظری سطح پر ہو یا عملی۔

اسلام کے نزدیک کسی فرد کی جائے پیدائش کا اس بات سے کوئی تعلق نہیں ہے کہ وہ کس طرح مسلم کہلوائے۔ یہ علاقائی خطاب نہیں ہے جس کا مقصد پھوٹ ڈالنا، دھڑے بندیاں قائم کرنا یا پھر ایسی رکاوٹیں تعمیر کرنا ہو جن کی مدد سے ایک قوم کو دوسری سے علیحدہ کیا جاتا ہے۔ اسلام مصنوعی تعلقات سے قطعاً واقف نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان ایک دفعہ دائرہ اسلام میں آنے کے بعد مسلمان ہی رہتا ہے چاہے اُس کی نسل، رنگ اور زبان یا علاقہ کچھ ہی ہو، وہ ہر مسلم ریاست کا شہری ہے توحید کا جوہر اُسے مساوات، استحکام اور آزادی کے عظیم تصورات سے ہمکنار کرتا ہے ریاست تو ان مثالی اُصولوں کو فضا اور وقت کی قوت میں تبدیل کرنے کی ایک سعی ہے۔ ان اُصولوں کو ایک متعین انسانی تنظیم میں تعبیر کرنے کی تمنا۔

حضرتِ اقبال قرآنِ حکیم کو اپنی بصیرت کا منبع قرار دیتے ہیں جس میں فرمایا گیا ہے کہ

"رنگ اور قومیت کچھ وقعت نہیں رکھتے۔ بارگاہِ الٰہی میں وزن رکھنے والی چیزیں تقویٰ اور صلاحیت اور اسے بروئے کار لانا ہے۔"

اسی طرح رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا ہے کہ :-

"اللہ تعالیٰ تمہارے جسموں کو نہیں دیکھتا اور نہ تمہاری صورتوں کو کہ خوبصورت ہیں یا بدصورت، بلکہ وہ تمہارے دلوں کو دیکھتا ہے کہ ان میں کتنا اخلاص اور حسنِ نیت ہے۔"

محسنِ انسانیت نے رنگ و نسل و قومیت کے بارے میں قیامت تک کے لئے منشورِ اعظم دیتے ہوئے حجۃ الوداع کے موقع پہ فرمایا کہ :-

"مسلمانو ! سُن لو کہ تمہارا پروردگار ایک اور باپ ایک ہے یعنی آدمؑ۔ عربی کو عجمی پہ اور عجمی کو عربی پہ، کالے کو گورے اور گورے کو کالے پر کوئی فضیلت نہیں، نہ کوئی برتری حاصل ہے، برتری صرف پرہیزگاری کو ہے۔"

حضرتِ علامہ قومیت کو محدود معنوں میں قبول کرتے ہیں۔ لیکن انہیں یہ بات پسند نہیں کہ یہ اسلامی معاشرتی فکر کی مستقل خصوصیت ہو، بحیثیت مستقل فلسفہ اُن کا خیال تھا۔ کہ قومیت دنیا کو جغرافیائی فرقوں میں تقسیم کر دیتی ہے۔ مسلم قومی ریاست لازمی طور پہ ایک نظریاتی ریاست ہوتی ہے۔ اس کے برعکس لادینی ریاست سے مُراد لوگوں کا وہ گروہ ہوتا ہے جو ایک علاقہ پہ قابض ہوتا ہے اور سیاسی تنظیم کا مالک ہوتا ہے، یہ آزاد ہوتا ہے یا آزاد ہونے کا آرزومند ہوتا ہے اس میں نسل، زبان، رواج، مفادات، مقاصد اور مذہب کا اشتراک ہوتا ہے، ماسوائے مذہب اسلام کے۔ حضرتِ علامہ صرف انتظامی مقاصد کی خاطر ان عناصر کو محدود حد تک قبول کرتے ہیں۔ لیکن اُن کا یہ ادعا اپنی جگہ مسلمہ ہے کہ یہ عناصر لوگوں کے اذہان میں وحدت پیدا نہیں کرتے، جو صرف دو عناصر کی رہینِ منت ہوتی ہے یعنی توحید الٰہی اور ختمِ نبوت کا اُصول۔ پس قومیت، وحدت کا ایک رُوحانی جذبہ ہے۔ اس اُصول کی عکاسی ان کے اس شعر میں ہوتی ہے ؎

بُتانِ رنگ و خُوں کو توڑ کر ملّت میں گُم ہو جا
نہ تُورانی رہے باقی، نہ ایرانی نہ افغانی

حکیم الاُمت نے اس مسئلے کو پوری طرح کھنگالا اور پھر فرمایا ؎

جو کرے گا امتیاز رنگ و خوں مٹ جائے گا
تُرک خرگاہی ہو یا اعرابی والا گھر

رینان کا قول ہے کہ "اسلام لعنتِ وطنیت، جنسیت، نسل اور رنگ کی قیود سے انسان کو آزاد کر دیتا ہے"۔

صرف رینان ہی نہیں دنیا کے ہر وسیع المشرب انسان نے وطنیت کو بنظرِ تحسین نہیں دیکھا۔ دانتے، گولڈ اسمتھ، نطشے، مارسلین، گوئٹے اور برنارڈ شا سب نے وطنیت کی مخالفت کی ہے اور اسے ذہنی پستی کا شاہکار قرار دیا ہے۔ کیونکہ یہ انسانیت کے ارتقا کی راہ میں مزاحم ہوتی ہے۔ اس کے محدود تصورات کی آڑ میں ظلم و استبداد اور خون ریزی کو بھی جائز قرار دے دیا جاتا ہے۔ حضرت علامہ بھی انہی خیالات سے متاثر ہو کر صنم کدہ عالم کو کعبہ اخوّت بنانے میں مصروف رہے کیونکہ ؎

اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے
قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

اور اس کے لئے منظوم افکار کے ساتھ تحریر و تقریر سے بھی جہاد کیا۔ نشاۃِ ثانیہ اسلامیہ کی آرزو کے جذبہ میں وہ سرشار تھے۔ اپنے ایک عقیدت مند کو لکھتے ہیں:۔

میرے نزدیک اسلام بنی نوع انسان کی اقوام کو جغرافیائی حدود سے بالاتر کرنے اور نسل و قومیت کی مصنوعی مگر ارتقاء انسانی کے ابتدائی مراحل میں مقید امتیازات کو مٹانے کا ایک عملی ذریعہ ہے۔ اسی وجہ سے اور مذاہب یعنی مسیحت، بدھ مت سے زیادہ کامیاب رہا ہے۔ چونکہ اس وقت ملکی اور نسلی قومیت کی لہر یورپ سے ایشیا میں آ رہی ہے اور میرے نزدیک انسان کے لئے یہ ایک بہت بڑی لعنت ہے۔ اس واسطے بنی نوع کے مفاد کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس وقت اسلام کے اصلی حقائق اور اس کے حقیقی پیش نہاد پر زور دینا نہایت ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں خالص اسلامی نقطۂ خیال کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھتا ہوں۔ ابتدا میں میں بھی قومیت پر اعتقاد رکھتا تھا اور ہندوستان کی متحدہ قومیت کا خواب شاید سب سے

پہلے میں نے دیکھا تھا۔ لیکن تجربے اور خیالات کی وسعت نے میرے خیال میں تبدیلی کر دی۔ اب قومیت میرے نزدیک محض ایک عارضی نظام ہے جس کو ہم ایک ناگزیر شئے سمجھ کر گوارا کرتے ہیں۔ پان اسلام ازم کی ایک سیاسی یا قومی تحریک تصوّر کرتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ ایک طریق چند اقوام انسانی کو جمع کرنے اور ان کو ایک مرکز پر لانے کا ہے۔"

حضرتِ علامہ نے وطنیت کے مغربی تصوّر کی مخالفت برائے مخالفت نہیں کی بلکہ انہوں نے اس نظریئے کی موجد ریاستوں کے معاشرتی عوارض کا بغور مطالعہ کیا جن میں وہ مبتلا ہیں۔ اس نظریئے پر عمل پیرا ہو کر وہ وفاداری کے کسی بڑے اور مضبوط مرکز کی متلاشی ہیں۔ مختلف سیاسی اور معاشی نظام اور دوبارہ گروہ بندی نئی سمت کے تعین کے عمل کے چند صریح آثار ہیں۔ اسی گردشِ دوراں اور ذلت سے بچنے کے لئے شاعرِ مشرق نے فکر کے اعلیٰ ترین حکیمانہ نظام میں بنیادی بات کہی ہے کہ دُنیا کے مسلمانوں کو خانہ خدا کے گرد جمع ہو جانا چاہیئے۔ اُن کے نزدیک ہر مسلم ریاست خودستائی کے فریب میں مبتلا نہیں ہے بلکہ دوسری اقوام کے لئے محبت اور ہمدردی رکھتی ہے بالفاظِ دیگر منتہائے مقصود محدود معنوں میں قومیت نہیں بلکہ بین الاقوامیت ہے۔ اقبال اس نکتے پر زور دیتے ہیں کہ مسلم ریاست جو اپنا انفرادی طغرائے امتیاز برقرار رکھتی ہے اس لئے اُسے عالمی ریاست کے قیام کے لئے اپنا کردار ادا کرنا چاہیئے وہ ایک ایسے حیات افروز نظریہ کے مبلغ تھے جس کا مقصد تمام گروہوں کو متحد کرنا ہے یہ گروہ اللہ تعالےٰ اور اس کے پیغمبر (صلعم) کے احکامات کی بجا آوری کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کوئی اپنا وطن نہیں اور اس کی جغرافیائی حدود محض نظم و نسق کی سہولت کے لئے ہیں۔ یہ ملّت کا فرض ہے کہ وہ نظامِ کائنات قائم کرے اور انسانیت کو زندگی کے روحانی اور اعلیٰ دارفع مقام پر پہنچائے۔ چونکہ اسلامی ریاست جغرافیائی حدود نسل اور زبان وغیرہ میں محدود نہیں ہے اس لئے وہ کوئی علاقائی حدود کی پابندی قبول نہیں کرتی بلکہ تمام روئے کائنات پر اللہ عزّوجل شانہ، کی سلطنت ہے —

حضرت علامہ اس تصور کو یوں بیان کرتے ہیں ؎

طارق چو بر کنارۂ اُندلس سفینہ سوخت | گفتند کار تو بہ نگاہِ خرد خطا ست
دوریم از سوادِ وطن باز چوں رسیم | ترکِ سبب ز روئے شریعت کجا رواست
خندید و دست خویش بہ شمشیر برد و گفت | ہر مُلک مُلکِ ماست کہ مُلکِ خدائے ماست

ایک اور جگہ فرمایا ؎

یہ بُت کہ تراشیدۂ تہذیبِ نوی ہے | غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبویؐ ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے | اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے
نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے | اے مصطفوی خاک میں اس بُت کو مِلا دے

پھر ارشاد ہُوا ؎

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

یقیناً، قرآن پاک بھی فرماتا ہے۔ ”ہم نے تمہیں قبائل میں بنایا تاکہ تمہاری شناخت ہو سکے۔ لیکن اللہ تعالےٰ کی نظر میں بہترین وہ ہے جو زندگی میں متقی ہے“۔

حضرت علامہ بھی نسل کے کسی بھی تصور کے خلاف ہیں کیونکہ ان کا کلام سراسر قرآن کریم کی تشریح ہے ؎

شوق میری لَے میں ہے، شوق میری نَے میں ہے
نغمہ اللہ ھُو میرے رگ و پے میں ہے

مشترکہ مذہب (اسلام کے سوا) اہمیت کے باعث غور طلب ہے۔ لیکن مشترک مذہب بھی لازماً سچی قومیت کی تشکیل نہیں کرتا۔ دنیا میں کئی ایسی ریاستیں ہیں جہاں کئی مذاہب رائج ہیں لیکن پھر بھی وہاں قومیت کی رُوح نہایت ہی مضبوط ہے، یوگوسلاویہ کو لیں وہاں سربس یونانی کیتھولک ہیں لیکن کروٹس رومن کیتھولک ہیں۔ سوئٹزرلینڈ میں کیتھولک بھی بستے ہیں اور پروٹسٹنٹ بھی۔ یہی معاملہ مشترکہ زبان اور ادب کا بھی ہے۔ زبان کا رنگ و آہنگ اُس زبان کے بولنے والوں کے خیالات کا رنگ و آہنگ متعین کرتا ہے۔ زبان کا اشتراک بلاشبہ وحدت کے احساس کی تشکیل میں مُمد ثابت ہوتا ہے۔ لیکن ہمیں اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ زبان و ادب یا ثقافت کا اشتراک لازمی طور پر قومیت کو جنم دیتا ہے۔ اہل بلجیم اور سوس قومیں ہیں اگرچہ وہ لسانی اعتبار

سے منقسم ہیں ۔ اور دوسری طرف آئرلینڈ اور انگلستان کی مشترکہ زبان انہیں ایک قوم نہ بنا سکی ۔

جغرافیائی وحدت بھی قومیت کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتی ہے ۔ قومیت حاصل کرنے کے لیئے یہ ضروری ہے کہ لوگ ایک خاص علاقہ پر قابض ہوں ۔ لیا اوقات ایسا ہو سکتا ہے لیکن دیگر عناصر کی طرح یہ عنصر بھی لازمی نہیں ہے ، یہودیوں کی اپنی قومیت تھی اگرچہ ۱۹۴۸ء تک اُن کا اپنا کوئی وطن نہیں تھا ۔

اصل وحدت فکری اور نظریاتی ہے ۔ اس لحاظ سے تمام دنیا کے مسلمان ایک وحدت ہیں ، مسلمان خواہ مراکش میں ہوں یا انڈونیشیا میں ، ان کے دلوں کی دھڑکنیں ایک ہی منزل کا پتہ دیتی ہیں ۔ ان کا مقصد حیات ختم نبوت کی بقا ہے ۔ چنانچہ مسلم ریاست کی سرحدیں اس کے پیروکاروں کے اذہان اور دل ہیں ۔ اُن کے عقائد اور اطاعت کی وحدت اُنہیں واحد روحانی گروہ بندی میں باندھتی ہے ، اُن کے مفادات ایک ایسے ہیں ، ایک ہی مقصد اور ایک ہی منزل ہے ۔ چونکہ مسلم قومیت کے تمام لوگوں کی ایک ہی آئیڈیالوجی ہے وہ ایک سیاسی گروہ کی تشکیل کرتے ہیں ۔ جس کی قیادت خلیفہ کرتا ہے جو مسلمانوں کو ترقی کی راہ پر گامزن کرتا ہے ۔ مسلم قوم پرستانہ آئیڈیالوجی اور یورپی قوم پرستانہ آئیڈیالوجی کے مابین بنیادی فرق یہ ہے کہ اوّل الذکر مذہبی بنیادوں پر قومیت پر یقین رکھتی ہے جبکہ مؤخر الذکر علاقہ ، زبان ، ثقافت اور مادّی مفادات کے اشتراک پر مشتمل ہے اور اس بات پر زور دیتی ہے کہ مذہب کی اہمیت صرف نجی دوائر تک محدود ہونی چاہیئے ۔ حضرت علامہؒ کے نزدیک ان میں سے ایک عنصر بھی قومیت کی تشکیل نہیں کرتا بلکہ اس کا انحصار توحید اور ختمِ نبوت کے اُصولوں پر ہے ۔ وطن کی محبت بھی ایک فطری اور لازمی چیز ہے ۔ حبُ الوطنی ایک علیحدہ چیز ہے اور وطن پرستی ایک جُدا بات ؎

پاک ہے گردِ وطن سے سرِ داماں تیرا
تُو وہ یوسفؑ ہے کہ ہر مصر ہے کنعاں تیرا

ایک اور جگہ فرمایا ہے ؎

نوعِ انساں قوم ہو میری ، وطن میرا جہاں ۔۔ لبتۂ رنگِ خصوصیت نہ ہو میری زباں

اسی طرح ارشاد ہوا ہے ؎

چیست ملّت ؟ ایکہ گوئی لَا اِلٰہ
با ہزاراں چشم بودن یک نگہ

حضرت علامہ عالمی ریاست کو اعلیٰ ترین مقصد کے حصول کا ذریعہ سمجھتے ہیں اسی لئے وہ اس کی اہمیت کو محسوس کرتے ہیں ؎

نہ تو زمین کے لئے ہے نہ آسمان کے لئے
جہاں ہے تیرے لئے، تو نہیں جہاں کے لئے

لیکن اس کے ساتھ ہی وہ حُبّ الوطنی کے احساسات کی اہمیت کو بھی تسلیم کرتے ہیں کیونکہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلّم نے فرمایا کہ "وطن سے محبت ایمان کا جزو ہے۔" ؎

ارشادِ نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے
گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے

فرماتے ہیں کہ " اگر مثالیت پسند میں زمین کے کسی حصے کے ساتھ محبت کے پائے جانے کا اطلاق ہوتا ہے تو یقیناً مثالیت پسندی قطعی طور پر بے معنی ہے، لیکن اگر حُبّ الوطنی سے مراد یہ ہے کہ انسان اپنے عقائد، مسلک، تاریخی روایات اور ثقافت کے لئے مرنے پر تیار رہے تو ایسی حب الوطنی مسلم تہذیب کا ایک جزوِ اہم ہے"، مزید فرماتے ہیں کہ " اگر قومیت سے مراد اپنے ملک سے محبت کرنا ہے حتیٰ کہ اس کی عظمت کے لئے مر مٹنے کے لئے تیار رہنا مراد ہے تو یہ مسلم مذہب کا حصہ ہے اس کا اسلام کے ساتھ تصادم صرف اسی وقت ہوتا ہے جب یہ سیاسی تصور کی حیثیت سے اپنا کردار شروع کرتی ہے اور انسانی استحکام کے اُصول ہونے کا دعویٰ کرتی ہے اور یہ مطالبہ کرتی ہے کہ اسلام نجی راستے کے پسِ منظر میں چلا جائے اور قومی زندگی میں جاندار عنصر کی اپنی حیثیت ختم کر دے، ترکی، ایران، مصر اور دیگر مسلم ممالک میں یہ کبھی بھی مسئلہ نہ بنے گی۔ ان ممالک میں مسلمانوں کی بھاری اکثریت ہے، اور اُن کی اقلیتیں جیسے یہودی عیسائی اور زرتشت اسلام کے قانون کے مطابق یا تو اہلِ کتاب ہیں یا ــــ

اہلِ کتاب کی مثل ہیں جن کے ساتھ اسلام آزاد معاشرتی تعلقات کی اجازت دیتا ہے بشمول ازدواجی تعلقات کے۔ یہ صرف اُن ممالک میں مسلمانوں کے لئے ایک مسئلہ کی شکل اختیار کرتی ہے جہاں وہ اقلیت میں ہیں اور قومیت اُن کی مکمل خود نیستی کا مطالبہ کرتی ہے۔ اکثریت والے ممالک میں اسلام قومیت کو ہم آہنگ کرتا ہے کیونکہ وہاں اسلام اور قومیت مماثل ہیں۔ اقلیت والے ممالک میں خود ارادیت کو بحیثیت ایک ثقافتی اکائی کے تلاش کرنا حق بجانب ہے۔ دونوں صورتوں میں یہ اپنے ساتھ ملتا جلتا ہے۔"

حضرت علامہ وطنی قومیت کی بُرائیوں سے کما حقہٗ آگاہ تھے کیونکہ یہ لوگوں میں فتنے اور اپنوں ہی میں پھوٹ ڈالنے کی ناپاک خواہش کے جذبات کو اُبھارتی ہے اسی لئے انہوں نے مسلمانوں کو اس سے اجتناب کرنے کی ہدایت کی اور فرمایا

اگر آپس میں لڑنا آج کل ہی ہے مسلمانی
مسلمانوں کو اب میں نا مسلمان کر کے چھوڑوں گا

اُنہوں نے ہندی مسلمانوں کے لئے ایک وطن کی ضرورت محسوس کی تاکہ وہ اپنے بنیادی حقوق کا تحفظ کر سکیں۔ "بیسویں صدی کے آغاز پر جب یورپی نوآبادیاتی طاقتیں ابھی مشرقِ وسطیٰ کے مسلم ممالک پر قبضہ کرنے کے عمل میں تھیں جبکہ ہندو اکثریت ہندوستان میں سیاسی طاقت حاصل کر چکی تھی۔ مسلمانوں کی حالت نہایت ہی ناگفتہ بہ ہو چکی تھی تو خلافتی سیاسی قیادت نے محسوس کیا کہ اسلام کی بقا صرف اُسی صورت میں ممکن ہے جب دُنیائے مسلم متحد ہو"

شاعرِ مشرق مغربی خطوط پر قومیت کو مسلمانوں کے لئے زہرِ ہلاہل سمجھتے ہیں، کیونکہ اس نے یورپ کو نقصان پہنچانے کے علاوہ دنیائے اسلام پر بھی اپنے ناخوشگوار اثرات مرتب کئے ہیں۔"

اولاً :۔ مسلم معاشرے کے سکون کو تہ و بالا کیا۔
ثانیاً :۔ مسلم آبادی کی وحدت کا شیرازہ بکھیر کر رکھ دیا۔

وہ صرف وطن کی بنا پر قومیت کے متعلق اپنے جذبات کو یوں بیان کرتے ہیں

ندانی نکتۂ دین عرب را کہ گوئی صبح روشن تیرہ شب را
اگر قوم از وطن بودے محمدؐ ندا دے دعوت دیں بولہب را

وہ اسلام کی وسیع تر کائناتی شہریت کی طرف توجہ مبذول کراتے ہیں ؎

چین و عرب ہمارا، ہندوستان ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے، سارا جہاں ہمارا

حکیم الامت نے مسلمانان عالم کے اتحاد کی خواہش کو یوں بیان فرمایا ؎

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر

ان کے اس عظیم خیال اور پیاری خواہش کی تائید اس شعر سے بھی ہوتی ہے ؎

مومن کے جہاں کی حد نہیں ہے
مومن کا مقام ہر کہیں ہے

پھر فرمایا ؎

درویشِ خدامست، نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر اس کا نہ دلّی، نہ صفاہاں نہ سمرقند

کیونکہ ع

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند

حضرت اقبال نے مشرق وسطیٰ میں جنگ عظیم اوّل کے بعد قومیت کی نشوونما کے بعد فرمایا کہ "اسلام نہ تو قومیت ہے اور نہ ہی سامراجیت بلکہ اقوام کی دولت مشترکہ"۔ اُن کی خط و کتابت اکثر مستشرقین سے رہا کرتی تھی انہوں نے ایک دفعہ مشہور مستشرق ڈاکٹر نکلسن، جنہوں نے مثنوی مولانا روم کا ترجمہ انگریزی زبان میں کر کے اپنے لئے شہرت دوام حاصل کر لی، کو لکھا:۔

"اسلام ہمیشہ رنگ و نسل کے عقیدے کا، جو انسانیت کی راہ میں سب سے بڑا سنگ گراں ہے، نہایت ہی کامیاب حریف رہا ہے۔ رینان کا یہ خیال غلط ہے کہ اسلام سائنس کا دشمن ہے حقیقت میں نہ صرف اسلام کا بلکہ تمام انسانیت کا سب سے بڑا دشمن رنگ و نسل کا عقیدہ ہے، جو لوگ بنی نوع انسان

سے محبت رکھتے ہیں ۔ان کا فرض ہے کہ ابلیس کی اس اختراع کے خلاف علَم جہاد بلند کریں ۔"

حضرت علامہ کے خیال میں فوقیت صرف اُسی وقت اسلام کے ساتھ متصادم ہوتی ہے جب عیسائیت کی طرح ، مذہب اور ریاست میں ایک خلیج پیدا کی جائے اس ضمن میں اُن کے خیالات درج ذیل ہیں[1]

" ریاست کے مذہبی اور سیاسی فرائض کی تقسیم یورپی نظریہ کلیسا اور ریاست کی علیٰحدگی کے ساتھ گڈمڈ نہیں کرنی چاہیئے ۔ اوّل الذکر صرف فرائض کی تقسیم ہے جیسا کہ مُسلم ریاستوں میں "شیخ الاسلام" اور وزراء کے مناصب کی تبدریج تخلیق سے ظاہر ہوتا ہے ۔ موخرالذکر رُوح اور مادے کی مابعد الطبعیاتی دوئی پر منحصر ہے ۔ عیسائیت کا آغاز راہبوں کے ایک ایسے نظام سے ہوا جس کا دنیا کے معاملات کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا ۔جبکہ اسلام شروع سے ہی ایک اجتماعی معاشرہ تھا جس کے اپنے قوانین تھے جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے معاشرتی تھے ۔اگرچہ اصلاً ان کے الہامی ہونے پر بھی یقین کیا جاتا ہے ۔ مابعد الطبعیاتی ثنویت جس پر یورپی نظریہ کی اساس ہے ، نے مغربی اقوام کے اندر تلخ اثرات پیدا کئے ہیں ۔"

آگے چل کر ارشاد فرمایا :۔

"مُسلم سیاسی تجربہ کی تاریخ میں یہ علیٰحدگی محض فرائض کی علیٰحدگی ہے نہ کہ خیالات کی ۔مُسلم ممالک میں یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ مذہب اور سیاست کی علیٰحدگی لوگوں کے ضمیر سے مسلم قانون سازی کی سرگرمی کی آزادی مراد ہے جس کی تربیت اور فروغ صدیوں تک اسلام کی روحانی خاصیت نے کی ہے ۔"

حضرت علامہ کے نزدیک اسلام ، ریاست کے بغیر ، ایک نہایت مبہم اصطلاح ہے ۔ اس کے بغیر معاشرتی مذہبی نظام مجموعی طور پر کام کرنا ختم کر دیتا ہے ۔مُسلم ریاست کے خاتمے نے معاشرتی سرگرمیوں کے ہر حلقۂ اثر میں شدید تغیر عظیم کو جنم دیا ۔ اُنیسویں صدی کے مقبول ترین نظریئے

---

[1] Iqbal, Dr. Mohammad; Islam, pp. 39-40.

'ایک قوم' اور 'ایک ریاست' کے برعکس وہ کثیر قومی ریاست کے وجود کی حمایت کرتے تھے۔ اس کی تائید اُن کے اس بیان سے ہوتی ہے[1]۔ "سیاسی لحاظ سے متحد اسلام کا غیر مسلموں کے بارے میں کیا رویہ ہوگا، اگر کبھی ایسا ہو جائے، یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب صرف تاریخ ہی دے سکتی ہے۔"

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اقبال علیہ الرحمتہ ایک قوم اور ایک ریاست کے اُصول کے حامی کیوں نہ تھے؟

یہ اُصول جغرافیائی اسباب کی بنا پر حقیقی طور پر پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچایا جا سکتا ہر قوم کی منزل جُدا ہے اور اُس کے مقاصد دوسری قوم کے ساتھ متصادم ہوتے ہیں۔ اُن کو یکجا کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن جو قومیتیں ایک دوسرے کے ساتھ گڈ مڈ ہیں، ان کو مختلف ریاستوں میں منظم کرنا ناممکن ہے۔ یہی مشکل جنگ عظیم اول کے بعد معاہدہ امن کے واضعین کو در پیش تھی کہ وہ علیحدہ علیحدہ پولش، جرمن اور اسی نوع کی ریاستیں تشکیل کریں۔ بعض مؤیدین دُور کی یہ کوڑی لاتے ہیں کہ ایک ایسی ریاست، جو کثیر قومیتوں پر مشتمل ہو، ایک متحدہ رائے عامہ کی تشکیل نہیں کر سکتی اور نہ ہی وہاں آزاد ادارے قائم کئے جا سکتے ہیں۔ یہ ایک شرمناک پراپیگنڈہ ہے۔ اس کا ابطال سوئٹزرلینڈ اور ریاستہائے متحدہ امریکہ کی مثالوں کی روشنی میں کیا جا سکتا ہے۔ اور لارڈ ایکٹن کے اس قول کا کیا کیا جائے کہ "ایک ریاست میں مختلف اقوام کا اتحاد تہذیب و تمدن کے لئے اتنی ہی ضروری شرط ہے جتنی کہ معاشرے میں انسانوں کا اتحاد۔ کمتر نسلوں کا معیار ذہنی لحاظ سے اعلیٰ نسلوں کے ساتھ سیاسی طور پر اتحاد سے بلند کیا جاتا ہے۔"

لاریب تاریخ کے آغاز پر قومیت عظیم حُریت پسندانہ اثر کی مالک تھی کیونکہ اس کی اساس حکومت خود اختیاری اور جمہوریت کے قیام کی استدلالی خواہش پر تھی یہ ترکی اور آسٹریا ہنگری کی مطلق العنان سلطنتوں کے لئے موت کا پیغام ثابت ہوئی۔

---

[1] Iqbal, Dr. Mohammad; Islam, p. 46.

ان ریاستوں کے حصے بخرے ہوئے۔ اور ان کی جگہ یورپ کی قومی ریاستیں اُبھریں اس طرح قومیت نے سیاست میں گہرا کردار ادا کیا۔ اس نے آمریت کا گلا دبایا اور جمہوریت کے ظہور کا باعث بنی۔ جمہوریت نے نمائندہ حکومت، مساوات اور قومیت کے تین اُصول پیش کئے۔ اس نے قومی رواج، روایات اور ثقافت کی تصاویر میں بھی رنگ بھرے، لوگوں کی خواہشات اور اُمنگوں کے پیشِ نظر قوانین وضع کئے گئے۔ اس کے باوجود کئی ناقدین نے قومیت سے پیدا شدہ بعض سنگین مشکلات کی بنا پر اسے ہدف تنقید بنایا ہے۔ اول تو یہ نسلی اور جغرافیائی وحدت پر زور دیتی ہے اور اس سے بھی بڑھ کر اہم مشکل جدید صنعتیت کے کردار سے عیاں ہے۔ کھلی تجارت کی وجہ سے سرمائے اور زمین کا ارتکاز ہوا کوئی قوم ایسی نہیں جو تمام پیداوار اپنے ہی تصرف میں لے آئے اسے فالتو اشیاء کے لئے منڈیاں تلاش کرنی پڑتی ہیں۔ منڈیوں کی تلاش کی کشمکش کا نتیجہ نوآبادیات، زیرِ حفاظت علاقوں، دوائر اثرات اور اسی طرح کے دیگر سیاسی عنوانات تھے۔ کسی قوم کی قوت میں اضافہ ہوا اور صنعتوں کے فروغ سے دولت آئی تو بالآخر جوعُ الارض کی خواہش نے جنم لیا۔ دریں اثنا جدید جنگ و جدل کی خصوصیت کے پیشِ نظر یہ ضروری ہے کہ قومی ریاست لازمی اشیاء میں خود کفالت حاصل کرے اور اس دوڑ کی منزل جدید صنعتیت ہے ایک قوم کا دوسری قوم کے متعلق معاندانہ روّیہ اُسے مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنی برتری کا ثبوت دے، اس مقصد کی خاطر اسلحہ کی دیوہیکل فیکٹریاں قائم کی جاتی ہیں اور عظیم افواج کا قیام عمل میں لایا جاتا ہے۔ اس سے عالمی ریاست کے قیام کی راہ میں مشکلات پیدا ہوتی ہیں جو اسلام کی منزل ہے اور حضرتِ علامہ جس کے داعی ہیں۔

لادینی نقطہ نگاہ سے بھی دیکھا جائے تو یہ ضروری ہے کہ عالمی ریاست کے لئے حالات سازگار ہوں۔ ایک قوم کی حیثیت سے ہمیں زندہ رہنے کا حق حاصل ہے لیکن ہمیں اپنی قومیت اور عالمی برادری کے اعلیٰ وارفع تناسب قلبی کے ساتھ مطابقت پیدا کرنی چاہیئے۔ لیکن اس منزل تک پہنچنے کے لئے ہمیں توحید اور

ختمِ نبوت کے اُصولوں کو صحیح معنوں میں اپنانا ہوگا۔ اس عالمی اسٹیج پر مسلم ریاستیں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنا سیکھیں گی۔ مسلم ریاستوں کا یہ فرض ہے کہ وہ دوسری ریاستوں کو باہمی تعاون کی راہ پر لے کر چلیں کیونکہ وہ روحانی روایات کی وارث ہیں۔ اُن کی اس سعی کا یہ نتیجہ نکلے گا کہ لادینی قومیت پر ضرب کاری پڑے گی اور اس سے پیدا ہونے والی برائیوں ۔ خوف، نفرت، حسد اور انتقام، نو آبادیات اور کمزوروں کا استحصال ۔ کا بھی قلع قمع ہو سکے گا۔ گویا مسلم قومیت اور لادینی قومیت دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اسلام انسان کو ایک ایسا معاشرتی نظام اور پاکیزگی کا تصوّر پیش کرتا ہے جس کی اساس عقیدے اور اخلاقی اقدار پر ہے۔ اس معاشرے میں نسلی اور قومی تعصبات کا وجود ناپاک نہ ہوگا اور تمام بنی نوعِ انسان ایک ثقافتی اور سیاسی نظام میں منسلک ہو جائیں گے اس میں فی الواقعہ اخوت، یگانگت اور مساوات کے مواقع بہم پہنچائیں گے۔ اس معاشرے کے افراد باہم شیر و شکر ہوں گے ؎

ان کی جمعیّت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تیری

لیکن قومیت کا منتہائے مقصود قومی ریاست کا قیام تو ہے مگر اسے عالمی ریاست کے قیام سے کوئی تعلق نہیں۔ ایک طرف لادینی نظام ہونے کے باعث یہ مذہب کو نجی معاملہ قرار دیتی ہے تو دوسری طرف یہ قومی اور نسلی تفاخر و تفوّق کے جذبات کو برانگیختہ کرتی ہے۔ قومی مفادات کے لئے یہ معاشی ترجیحات کی رکاوٹیں بھی کھڑی کر دیتی ہے اور ان کا تحفظ تاریخی روایات اور تعصبات کی مدد سے کرتی ہے۔ مسلم قومیت انسان کی وسعتِ نظر کو تنگ نہیں کرتی جیسا کہ لادینی قومیت کرتی ہے۔ اسلامی آئیڈیالوجی کا قطعی مقصد اس کے پیشِ نظر ہوتا ہے یعنی مختلف اقوام کو متحد اور منسلک کرنے کی قوت اور عنصر۔ حضرت اقبال کا ارشاد ہے کہ اسلام کا بالآخر مقصد یہ ہے کہ ہر قوم اور ہر نسل کو اپنی فطری خصوصیات اور جبلّی امکانات کے نشوونما کے بھرپور مواقع ملیں تاکہ بنی نوع انسان اجتماعی لحاظ سے ترقی کی معراج کو پہنچ سکے۔ اسلام میں جارحیت کا شائبہ تک

بھی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ غیر مسلموں کے فطری جواہر اور ذرائع ترقی کو مسدود نہیں کرتا اور نہ ہی انہیں بنیادی اور اولین حقوق سے محروم کرتا ہے۔ لیکن حضرت علامہ بعض حدود کے اندر رہ کر قومی تحفظ کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ وہ بار بار اس نکتے پر زور دیتے ہیں کہ مسلم اقوام کی منزل خود ستائی تک محدود نہیں ہونی چاہیے بلکہ اس کی وسعت مجموعی اعتبار سے تمام انسانیت کے ساتھ ہمدردی اور تعاون تک پھیلی ہونی چاہیئے یہ وہ احساساتِ صالحہ ہیں جو صرف مسلم ریاست میں ہی رہ کر حاصل ہو سکتے ہیں کیونکہ اس کی بنیاد آئیڈیالوجی ہوتی ہے۔

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام عالمگیر تھا۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ آپ پر جو کتاب نازل ہوئی اسے بھی بین الاقوامی درجہ حاصل ہو۔ حضرت علامہ قرآن پاک کے پیغام کی روشنی میں مسلم قومیت کو قابل ستائش، تعمیری اور تخلیقی قوت قرار دیتے ہیں اسے مقامی روایات، معیار اور رواجات کے چھاتے تلے زندگی کے تمام پہلوؤں کے متعلق ترقی کا عزم صمیم کرنا چاہیئے ؎

تمیز رنگ و خون بر ما حرام است
کہ ما پروردۂ یک نوبہاریم

"بین الاقوامیت ہر معاملہ میں ایک ایسے طرز عمل کا اطلاق کرتی ہے جو سیاسی عمل اور روحانی روایات کی حیثیت سے قوم کی اہمیت گھٹاتی ہے۔ عصر حاضر میں کوئی قوم بھی معاشی ضروریات اور بین الاقوامی تجارت کی بنا پر تفرد یت کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ قومیت صرف اس حد تک ضروری ہے کہ یہ اپنے پل کے نیچے بین الاقوامیت کے پانی کو نہ روکے۔"

اس طرح حضرتِ اقبال یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ قومیت اور بین الاقوامیت اسلام میں دو متضاد تصورات نہیں ہیں۔ وہ وطنی قومیت کو ایک محدود سی قسم میں پیش کرتے ہیں لیکن اسے اسلامی سماجی فکر کے لئے مستقل نہیں بنانا چاہتے۔ وطنی قومیت صرف انتظامی مقاصد کے لئے ضروری ہے لیکن یہ چیز وحدت پیدا نہیں کرتی وحدت تو توحیدِ الٰہی اور ختم نبوت کے اصولوں سے جنم لیتی ہے۔ پس قومیت۔ ایک روحانی اساس ہے جس کا رنگ و نسل سے کوئی علاقہ نہیں ؎

یہی مقصودِ فطرت ہے یہی رمزِ مسلمانی
اخوّت کی جہانگیری ، محبت کی فراوانی

حکیم الاُمّت کی فکر نے ہندوستان کی سیاست میں سارے زمانہ سے الگ راہ اختیار کی۔ وطنیت اور قومیت کے نظریات کو سمِ قاتل قرار دیا اور مسلمانوں میں ایک الگ ملّی وجود کے فکر کی لگاتار آبیاری کی۔ اُن کی انہی تعلیمات کے پیشِ نظر اُن کو ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ الٰہ آباد میں خطبہ صدارت پیش کرنے کی دعوت دی گئی۔ جلسہ الٰہ آباد کا آنکھوں دیکھا حال جناب احمد الدین ماہر دی کی زبانی سُنیئے[1]

" شاعرِ اعظم کے استقبال کے لئے تمام شہر اُمڈ آیا جس میں مسلمانوں کی ترکی ٹوپیوں عمّاموں اور پگڑیوں کے درمیان ہندوؤں کی فلیٹ ٹوپیاں بھی خاصی تعداد میں نظر آتی تھیں الٰہ آباد کے بزرگ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنی عمر میں اتنا مجمع کبھی نہ دیکھا تھا۔ انسانوں کے اس بحرِ زخّار میں ترتیب و تنظیم قائم رکھنا کسی بڑے سے بڑے لیڈر کے لئے بھی دشوار ہوتا۔ چہ جائیکہ یہاں شروع سے کوئی لیڈر تھا ہی نہیں۔ پلیٹ فارم، پُل، مال گاڑی کے ڈبوں کی چھت، حتیٰ کہ اسٹیشن کے باہر بھی تِل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ ہر شخص صرف ایک نظر دیکھنے کا متمنی تھا اور کوشش کر رہا تھا کہ اگلی صف میں پہنچ جائے۔ گہما گہمی ناقابلِ بیان تھی لیکن اس جمِ غفیر کے باوجود بدنظمی بالکل نہیں تھی۔ یہ شاید علامہ کا اعجاز تھا۔ علامہ کے ساتھ کچھ لوگ اور بھی تھے جن میں سر عبد القادر اور ڈاکٹر عبد اللہ چغتائی نمایاں تھے۔ خیر مقدم کی طرح جلوس بھی نہایت کامیاب رہا۔

شہر میں تصادم کے خوف کے باعث میو ہال کے بجائے گرانڈ ٹرنک روڈ پر خسرو باغ کے نزدیک ایک حویلی میں جلسہ کا انتظام کیا گیا۔ حاضرین کی تعداد بہت کم تھی: بے دیکر مسلم ہوسٹل کے طلبہ کی ایک ٹولی تھی۔ علامہ کا خطبہ صدارت انگریزی میں چھپا ہوا تقسیم کیا گیا۔ علامہ خطبہ پڑھتے جاتے اور جگہ جگہ رُک کر کبھی کسی تشریحی جملے سے، کبھی کلام پاک کی آیت اور کبھی حدیث سے مطالب کی وضاحت فرماتے جاتے تھے۔

---

[1]: جلسہ الٰہ آباد کا آنکھوں دیکھا حال اُردو ڈائجسٹ (لاہور) اپریل ۱۹۶۷ء۔

شروع میں اسلام کو ایک نظامِ زندگی کی حیثیت سے پیش کر کے اس کا موازنہ عیسائیت کی کلیسائی تنظیم سے کیا اور بتایا کہ اسلام میں خدا اور نظامِ کائنات، مادّیت اور روحانیت، مذہب اور سلطنت ایک دوسرے میں مدغم ہیں اور ہمارے ہاں روحانیت کے لئے ترک کر دینا ضروری نہیں۔ لیکن اس کے برخلاف یورپ روح اور مادّے کی جداگانہ حیثیت تسلیم کر کے دو عملی کا شکار ہو گیا ہے۔ اس کے بعد علامہ نے یورپ میں عیسائیت اور ہندوستان میں اسلام کا موازنہ پوری شرح و بسط کے ساتھ کیا۔" آخر میں خطبے کو سورۂ مائدہ کی اس آیت پر ختم کیا جس کا مفہوم یہ ہے :-

"مسلمانو! اپنی حفاظت خود کرو، جب تک تم سیدھے راستے پر رہو۔ کوئی گمراہ تم کو کچھ نقصان نہ پہنچا سکے گا۔"

اجلاس میں مسلم کانفرنس ۱۹۲۹ء والی قرار داد کی تائید کی گئی اور جو مسلمان گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے گئے تھے اُن کی خدمات کا اعتراف کیا گیا۔[۱]

حضرت علامہ نے فرمایا :-

"حضرات! میں آپ کا بے حد ممنون ہوں کہ آپ نے ایسے وقت میں مجھے آل انڈیا مسلم لیگ کی صدارت کا اعزاز بخشا ہے جبکہ مسلمانانِ ہندوستان کی سیاسی زندگی نے ایک نہایت نازک صورت اختیار کر لی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس عظیم الشان اجتماع میں ان حضرات کی کمی نہیں جن کا تجربہ مجھ سے کہیں زیادہ وسیع ہے اور جن کے معاملات فہمی کا میں دل سے قائل ہوں۔ لہٰذا یہ بڑی جسارت ہوگی اگر ان مسائل میں جن کے فیصلہ کے لئے آج یہ حضرات جمع ہوئے ہیں ان کی رہنمائی کا دعویٰ کروں۔ میں کسی جماعت کا رہنما نہیں ہوں، نہ کسی جماعت کا پیرو ہوں۔ میں نے اپنی زندگی کا نمایاں حصّہ اسلام اور اسلامی فقہ، سیاست تہذیب، تمدن اور ادبیات کے مطالعہ میں صرف کیا ہے، میرا خیال ہے کہ اس مسلسل اور متواتر تعلق کی بنا پر جو مجھے تعلیماتِ اسلامی کی روح سے جیسا کہ مختلف زبانوں میں اس کا اظہار ہوا ہے، میں نے اس امر کے متعلق

---

[۱]:- مسلمانوں کا روشن مستقبل صفحہ ۳۵۱ مولانا طفیل منگلوری، کتب خانہ عزیزیہ دہلی (۱۹۴۵ء)

ایک خاص بصیرت پیدا کرلی ہے کہ ایک عالمگیر حقیقت، کے اعتبار سے اسلام کی حیثیت کیا ہے۔ لہٰذا یہ فرض کرتے ہوئے کہ مسلمانانِ ہندوستان بہر حال اپنی اسلامی روح کو برقرار رکھنے پر مُصر ہیں۔ میں کوشش کروں گا کہ آپ کے فیصلوں کی رہنمائی کے بجائے اسی بصیرت کی روشنی میں خواہ اس کی قدر و قیمت کچھ بھی آپ کے دل میں ہو اُسی بنیادی اُصول کا احساس پیدا کروں جس پر میری رائے میں ہمارے تمام فیصلوں کا عام انحصار ہونا چاہیئے۔ یہ کہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ بحیثیت ایک انقلابی نصب العین اور نظامِ سیاست کے (اس آخری لفظ سے میرا مطلب ایک ایسی جماعت ہے جس کا نظم اور انضباط کسی نظامِ قانون کے ماتحت عمل میں آتا ہو اور جس کے اندر ایک مخصوص اخلاقی رُوح سرگرم کار ہو) اسلام ہی وہ سب سے بڑا جزو ترکیبی ہے جس سے مسلمانانِ ہند کی تاریخ حیات متاثر ہوئی۔ اسلام ہی کی بدولت مسلمانوں کے سینے ان جذبات و عواطف سے معمور ہوئے۔ جن پر جماعتوں کی زندگی کا دارومدار ہے اور جن سے متفرق اور منتشر افراد بتدریج متحد ہو کر ایک متمیز اور متعین قوم کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور اس طرح ان کے اندر ایک مخصوص اخلاقی شعور پیدا ہو جاتا ہے۔ حقیقت میں یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ دنیا بھر میں شاید ہندوستان ہی ایک ایسا ملک ہے جس میں اسلام کی وحدت خیز قوت کا بہترین اظہار ہوا ہے دوسرے ممالک کی طرح ہندوستان میں بھی جماعت اسلامی کی ترکیب صرف اسلام ہی کی رہینِ منت ہے کیونکہ اسلامی تمدن کے اندر ایک مخصوص اخلاقی رُوح کارفرما ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کا اندرونی اتحاد اور ان کی نمایاں یکسانیت ان قوانین اور ادارات کے شرمندہ احسان ہے جو تہذیب اسلامی سے وابستہ ہیں۔ لیکن اس وقت مغرب کے سیاسی افکار نے نہایت تیزی کے ساتھ نہ صرف ہندوستان بلکہ ہندوستان سے باہر تمام دنیائے اسلام میں انقلاب برپا کر رکھا ہے۔ نوجوان مسلمانوں کی یہ خواہش ہے کہ وہ ان افکار کو اپنی زندگی کا ایک جزو بنالیں — انہوں نے اس امر پر مطلق غور نہیں کیا کہ وہ کون سے اسباب تھے جن کے ماتحت

ان افکار نے مغرب میں نشو ونما پائی۔

یاد رکھنا چاہیئے کہ سرزمین مغرب میں مسیحیت کا وجود محض ایک رہبانی نظام کی حیثیت رکھتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس سے کلیسا کی ایک وسیع حکومت قائم ہوئی۔ لوتھر کا احتجاج دراصل اسی کلیسائی حکومت کے خلاف تھا۔ اس کو دنیوی نظام سیاست سے کوئی بحث نہیں تھی کیونکہ اس قسم کا نظام سیاست مسیحیت میں موجود نہیں تھا۔ غور سے دیکھا جائے تو لوتھر کی بغاوت ہر طرح سے حق بجانب تھی، اگرچہ میری رائے یہ ہے کہ خود لوتھر کو بھی اس امر کا احساس نہ تھا کہ جن مخصوص حالات کے ماتحت اس کی تحریک کا آغاز ہوا ہے اس کا نتیجہ بالآخر یہ ہوگا کہ مسیح علیہ السلام کے عالمگیر نظام اخلاق کی جائے مغرب میں ہر طرف بے شمار ایسے اخلاقی نظام پیدا ہو جائیں گے جو خاص خاص قوموں سے متعلق ہوں گے لہذا ان کا حلقہ اثر بالکل محدود رہ جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ جس ذہنی تحریک کا آغاز لوتھر اور روسو کی تحریک سے ہوا اس نے مسیحی دنیا کی وحدت کو توڑ کر اسے ایک ایسی غیر مربوط اور مشترکہ کثرت میں تبدیل کر دیا جس سے اہل مغرب کی نگاہیں اس عالمگیر مطمع نظر سے ہٹ کر جو تمام نوع انسان سے متعلق تھا اقوام اور ملل کی تنگ حدود میں الجھ گئیں۔ اس نئے تخیل حیات کے لئے انہیں اس سے کہیں زیادہ واقعی اور مرئی احساس مثلاً تصور وطنیت کی ضرورت محسوس ہوئی جس کا اظہار بالآخر ان سیاسی نظامتوں کی شکل میں ہوا جنہوں نے جذبۂ قومیت کے ماتحت پرورش پائی یعنی جن کی بنیاد اس عقیدہ پر ہے کہ سیاسی اتحاد اور اتفاق کا وجود عقیدۂ وطنیت ہی کے ماتحت ممکن ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر مذہب کا تصور یہی ہے کہ اس کا تعلق صرف آخرت سے ہے اور انسان کی دنیوی زندگی سے اس کو کوئی سروکار نہیں، تو جو انقلاب مسیحی دنیا میں رونما ہوا ہے وہ ایک طبعی امر تھا۔ مسیح علیہ السلام کا عالمگیر نظام اخلاق نیست و نابود ہو چکا ہے اور اس کی جگہ اخلاقیات اور سیاسیات کے قومی نظام نے لے لی ہے

اس سے اہل مغرب بجا طور پر اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ مذہب کا معاملہ ہر فرد کی اپنی ذات تک محدود ہے۔ اسے دنیوی زندگی سے کوئی تعلق نہیں لیکن اسلام کے نزدیک ذات انسانی بجائے خود ایک وحدت ہے، وہ مادہ اور روح کے کسی۔

ناقابل اتحاد ثنویت کا قائل نہیں۔ مذہب اسلام کی رُو سے خُدا اور کائنات، کلیسا اور ریاست اور رُوح و مادہ ایک ہی کُل کے مختلف اجزاء ہیں۔ انسان کسی ناپاک دُنیا کا باشندہ نہیں جس کو اسے ایک رُوحانی دنیا کی خاطر جو کسی دوسری جگہ واقع ہے ترک کر دینا چاہیئے۔ اسلام کے نزدیک مادّہ روح کی اس شکل کا نام ہے جس کا اظہار قید مکانی و زمانی میں ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مغرب نے مادّہ اور روح کی ثنویت کا عقیدہ بلا کسی غور و فکر کے معنویت کے زیر اثر قبول کر لیا ہے۔ اگرچہ آج اس کے بہترین ارباب فکر اپنی اس ابتدائی غلطی کو محسوس کر رہے ہیں مگر سیاستدانوں کا طبقہ ایک طرح سے اب بھی مُصر ہے کہ دنیا ایک اُصول کو ایک ناقابل انکار حقیقت کے طور پر تسلیم کر لے دراصل یہ روحانی اور دنیوی زندگی کا غلط امتیاز ہے جس سے مغرب کے سیاسی اور مذہبی افکار بیشتر طور پر متاثر ہوئے ہیں اور جن سے یورپ کی مسیحائی ریاستوں نے عملاً مذہب سے کلیتاً علیحدگی اختیار کر لی ہے اس سے چند متفرق اور بے ربط سلطنتیں قائم ہو گئی ہیں۔ جن پر کسی انسانی جذبے کے بجائے قومی اغراض کی حکمرانی ہے۔ مگر لطف یہ ہے کہ آج یہی سلطنتیں ہیں جو مسیحیت کے اخلاقی اور مذہبی عقائد کی پائمالی کے بعد ایک متحدہ یورپ کا خواب دیکھ رہی ہیں بالفاظ دیگر ان کو ایسے اتحاد کی ضرورت کا احساس ہو چلا ہے جو کلیسا کے ماتحت انہیں حاصل تو تھا لیکن جس کو اخوّت انسانی کے اس عالمگیر تصور کی روشنی میں تعمیر کی بجائے جو مسیح علیہ السلام کے دل میں موجود تھا انہوں نے تُوتھر کے زیر اثر تباہ و برباد کر دیا۔

بہر حال دُنیائے اسلام میں کسی تُوتھر کا ظہور ممکن نہیں، اس لئے کہ اسلام میں کلیسا کا کوئی ایسا نظام موجود نہیں جو ازمنۂ وسطیٰ کے مسیحی نظام سے مشابہ ہو اور جس کے توڑنے کی ضرورت پیش آئی۔ دنیائے اسلام کے پیشِ نظر ایک ایسا عالمگیر نظام سیاست ہے جس کی اساس وحی اور تنویل پر ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ چونکہ ہمارے فقہا کو ایک عرصے عملی زندگی کا کوئی تعلق نہیں رہا اور وہ عہد جدید کی داعیت سے بالکل بیگانہ ہیں لہٰذا اس امر کی ضرورت ہے کہ اس میں ہم از سرِ نو قوت پیدا کرنے کے لئے اس کی تعمیر و ترکیب کی طرف متوجہ ہوں۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ بالآخر تصور قومیت کا انجام ملّت اسلام میں کیا ہوگا؟

آیا اسلام اس تصوّر کو اپنے اندر جذب کر کے اس کو اس طرح بدل دے گا جس طرح اس سے پیشتر اس نے اس سے بالکل مختلف تصورات کی ترکیب و نوعیت کو ہمہ تن بدل دیا تھا۔ یا یہ کہ خود اسلام کے اندر کوئی زبردست تغیّر رونما ہو جائے گا۔ کچھ روز ہوئے پروفیسر ونسنک نے مجھے لیڈن (ہالینڈ) سے اپنے ایک خط میں لکھا تھا کہ اسلام نے اس وقت اس نازک دور میں قدم رکھا ہے جس میں داخل ہوئے مسیحیت کو ایک صدی سے زیادہ عرصہ گذر چکا ہے اس وقت سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ بہت سے قدیم تصورات ترک کر دینے کے باوجود مذہب کی بنیادوں کو تزلزل اور انتشار سے محفوظ رکھنے کی صورت کیا ہے؟ پروفیسر موصوف کہتے ہیں کہ وہ ابھی تو اس امر کا فیصلہ نہیں کر سکے اس کا نتیجہ مسیحیت کے حق میں کیا ہوگا۔ اسلام کے متعلق کوئی پیش گوئی کرنا اور بھی ناممکن ہے اس وقت قوم اور وطن کے تصور میں مسلمانوں کی نگاہوں کو نسل اور خون کے امتیاز نے اُلجھا دیا ہے اور وہ اسی طرح اسلام کے انسانیت پرور مقاصد میں عملاً حارج ہو رہا ہے ممکن ہے کہ یہ نسلی احساسات ترقی کرتے کرتے ان اُصول و قواعد کے محرک بنیں جو تعلیمات اسلامی کے بالکل مخالف ہی نہیں بلکہ ان سے بالکل متضاد ہوں۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ حضرات اس خالص علمی بحث کے لئے مجھے معاف فرمائیں گے لیکن آپ نے آل انڈیا مسلم لیگ کی صدارت کے لئے ایک ایسے شخص کو نامزد کیا ہے جو اس امر سے مایوس نہیں ہو گیا ہے کہ اسلام اب بھی ایک زندہ قوت ہے جو ذہن انسانی کو وطن اور نسل کی قیود سے آزاد کر سکتی ہے جس کا یہ عقیدہ ہے کہ مذہب کو ریاست اور فرد دونوں کی زندگی میں غیر معمولی اہمیّت حاصل ہے اور جسے یقین ہے کہ اسلام کی تقدیر خود اس کے اپنے ہاتھ میں ہے اسے کسی دوسری تقدیر کے حوالے نہیں کیا جا سکتا۔ ایسا شخص مجبور ہے کہ جس معاملہ پر غور کرے اپنے نقطۂ نظر کے ماتحت کرے۔ آپ یہ خیال نہ فرمائیے گا کہ جس مسئلہ کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے وہ محض نظری حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ایک زندہ اور عملی سوال ہے جس سے بطور ایک دستورِ حیات اور نظام عمل کے اسلام کی ساری کائنات متاثر ہو سکتی ہے صرف یہی ایک مسئلہ ہے جس کے صحیح حل پر اس امر کا دار و مدار ہے کہ ہم لوگ آگے چل کر ایک آزاد اور ایک ممتاز اور متمیّز تہذیب کے حامل بن سکیں۔ اسلام پر ابتلاء اور آزمائش کا کبھی ایسا سخت

وقت نہیں آیا جیسا کہ آج درپیش ہے۔ ہر قوم کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ بنیادی اصولوں کی ترمیم اور تعمیر کرے یا ان کو یک قلم منسوخ کر دے۔ لیکن اس قسم کا قلم اُٹھانے سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ اس کے نتائج و عواقب کیا ہوں گے۔ میں نہیں چاہتا کہ جس انداز سے میں نے اس مسئلہ پر نظر ڈالی ہے اس سے کسی شخص کو یہ غلط فہمی ہو کہ جن حضرات کو میرے خیالات سے اتفاق نہیں ہے میں اُن سے بے کار مناقشت کا دروازہ کھولنا نہیں چاہتا ہوں۔ یہ مسلمانوں کا اجتماع ہے جن کے متعلق مجھے یقین ہے کہ وہ اسلام کے مقاصد اور اس کی تعلیمات پر قائم رہنے کے دل سے آرزومند ہیں۔ میرا مقصد صرف اس قدر ہے کہ موجودہ حالات کے متعلق میں نے جو رائے قائم کی ہے اس کا آزادی کے ساتھ اظہار کر دوں۔ میرے نزدیک یہی ایک صورت ہے اس امر کی کہ میں آپ کی سیاسی راہوں کو اپنے عقائد کی روشنی میں منور کر سکوں

سوال یہ ہے کہ آج جو مسئلہ ہمارے سامنے پیش ہے اس کی حیثیت کیا ہے؟ کیا واقعی مذہب ایک نجی معاملہ ہے اور آپ بھی یہی چاہتے ہیں کہ ایک اخلاقی اور سیاسی نصب العین کی حیثیت سے اسلام کا بھی وہی حشر ہو جو مغرب میں مسیحیت کا ہوا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم اسلام کو بطور ایک اخلاقی تخیل کے تو برقرار رکھیں لیکن اس کے نظامِ سیاست کے بجائے ان قومی نظامات کو اختیار کر لیں جن میں مذہب کی مداخلت کا کوئی امکان نہیں ملتا۔ ہندوستان میں یہ سوال اور بھی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ باعتبار آبادی ہم لوگ اقلیت میں ہیں۔ یہ دعویٰ کہ مذہبی واردات محض انفرادی اور ذاتی واردات ہیں اہل مغرب کی زبان سے تو تعجب خیز معلوم نہیں ہوتا کیونکہ یورپ کے نزدیک مسیحیت کا تصور ہی یہی تھا کہ وہ ایک مشرب رہبانیت ہے، جس نے دنیائے مادیت سے منہ موڑ کر اپنی تمام تر توجہ عالم روحانیت پر جما لی ہے۔ اس قسم کے عقیدے سے لازماً وہی نتیجہ برآمد ہو سکتا ہے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی واردات مذہب کی حیثیت، جیسا کہ قرآن پاک میں اس کا اظہار ہوا ہے، اس سے قطعاً مختلف ہیں یہ محض حیاتی نوع کی واردات نہیں ہیں جن کا تعلق صرف صاحبِ واردات کے اندرونِ ذات سے ہو۔ لیکن اس کے باہر اس کے گرد و پیش کی معاشرت

پر اس کا کوئی اثر نہ پڑے۔ برعکس اس کے کہ وہ انفرادی واردات ہیں۔ جن سے بڑے بڑے اجتماعی نظامات کی تخلیق ہوتی ہے، اور جن کے اولین نتیجہ سے ایک ایسے نظامِ سیاست کی تاسیس ہوئی جس کے اندر قانونی تصورات مضمر تھے اور جن کی اہمیت کو محض اس لئے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی بنیاد وحی اور الہام پر ہے۔ لہٰذا اسلام کا نصب العین اس کے معاشرتی نظام سے جو خود اسی کا پیدا کردہ ہے الگ نہیں، دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ اگر آپ نے ایک کو ترک کیا تو بالآخر دوسرے کا بھی ترک کرنا لازم آئے گا۔ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی مسلمان ایک لمحہ کے لئے بھی کسی ایسے نظامِ سیاست پر غور کرنے کے لئے آمادہ ہوگا جو کسی ایسے وطنی یا قومی اُصول پر مبنی ہو جو اسلام کے اُصولِ اتحاد کے منافی ہو، یہ وہ مسئلہ ہے جو آج مسلمانانِ ہند کے سامنے ہے۔

مشہور فرانسیسی عالم دانیال کا قول ہے کہ انسان نہ نسل کی قید برداشت کر سکتا ہے اور نہ مذہب کی، نہ دریاؤں کا بہاؤ اس کی راہ میں حائل ہو سکتا ہے نہ پہاڑوں کی سمتیں اس کے دائرہ کو محدود کر سکتی ہیں اگر اس کا صحیح دماغ موجود ہے اور ان کے دلوں میں جذبات کی گرمی ہے تو ان کے اندر وہ اخلاقی شعور پیدا ہو جائے گا جسے ہم لفظ "قوم" سے تعبیر کرتے ہیں۔ مجھے اس قسم کی ترکیب و اجتماع سے انکار نہیں اگرچہ یہ ایک نہایت طویل اور صبر آزما عمل ہے اس لئے کہ اس کا مطلب انسان کی زندگی کو ایک نئے سانچے میں ڈھالنا ہے اور اس کے جذبات اور احساسات کی دنیا کو یکسر پلٹ دینا ہے۔ اگر اکابر دین الٰہی یا کبیر کی تعلیمات عوام الناس میں مقبول ہو جائیں تو ممکن تھا ہندوستان میں بھی اس قسم کی ایک نئی قوم پیدا ہو جاتی۔ لیکن تجربہ بتلاتا ہے کہ ہندوستان کے مختلف مذاہب اور متعدد جاتیوں میں اس قسم کا کوئی رجحان نہیں ہے کہ وہ انفرادی حیثیت کو ترک کر کے ایک وسیع جماعت کی حیثیت اختیار کر لیں۔ ہر گروہ اور ہر مجموعہ مضطرب ہے کہ اس کی ہیئت اجتماعی قائم رہے لہٰذا اس قسم کا اخلاقی شعور جو رینان کے نزدیک کسی قسم کی تخلیق کے لئے ناگزیر ہے ایک عظیم قربانی کا طالب ہے جس کے لئے ہندوستان میں کوئی جماعت تیار نہیں

قومیت ہند کا اتحاد ان تمام جماعتوں کی نفی میں نہیں بلکہ ان کے تعاون اور اشتراک اور ہم آہنگی پر مبنی ہے۔ صحیح تدبر کا تقاضا ہے کہ ہم حقائق کا خواہ وہ کیسے ہی ناخوشگوار کیوں نہ ہوں اعتراف کریں۔ حصولِ مقاصد کی عملی راہ یہ نہیں ہے کہ ایک ایسی حالت کو فرض کر لیا جائے جو واقعتاً موجود نہ ہو۔ ہمارا طریق کار یہ ہونا چاہیئے کہ ہم واقعات کی تکذیب کے بجائے ان سے جہاں تک ہو سکے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کریں۔ میری رائے میں ہندوستان اور ایشیا کی قسمت صرف اس بات پر مبنی ہے کہ ہم قومیت ہند کا اتحاد اسی اُصول پر قائم کریں۔ اگر ہم ہندوستان کو چھوٹا ایشیا قرار دیں تو غیر مناسب نہ ہوگا اہلِ ہند کا ایک حصّہ اپنی تہذیب و تمدن کے اعتبار سے مشرق اقوام سے مشابہ ہے لیکن اس کا دوسرا حصّہ ان قوموں سے ملتا جلتا ہے جو مغربی اور وسطی ایشیا میں آباد ہیں اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر ہندوستان کے اندر اشتراک اور تعاون کی کوئی موثر راہ نکل آئی تو اس سے نہ صرف اس قدیم ملک میں جو اپنے باشندوں کی کسی طبعی خرابی کی وجہ سے نہیں بلکہ محض اپنی جغرافیائی حیثیت کے باعث ایک عرصۂ دراز سے مصائب و فتن کا تختۂ مشق بن رہا ہے، صُلح و آشتی قائم ہو جائے گی بلکہ اس کے ساتھ ہی تمام ایشیا کا سیاسی عقدہ بھی حل ہو جائے گا۔ بایں ہمہ یہ امر کس قدر افسوس ناک ہے کہ اب تک ہم نے باہمی تعاون و اشتراک کی جس قدر کوششیں کی ہیں یہ سب ناکام ثابت ہوئی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ہماری ناکامی کا باعث کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ شاید ہمیں ایک دوسرے کی نیتوں پر اعتماد نہیں اور باطناً ہم تغلب و اقتدار کے خواہشمند ہیں یا یہ ممکن ہے کہ ہم اتحاد و تعاون کے مقاصدِ عالیہ کے لئے اتنا ایثار بھی نہیں کر سکتے کہ اب تک جو اجارات بھی ہمیں کسی نہ کسی طرح حاصل ہو گئے ہیں ان سے دستبردار ہو جائیں۔ ہم اپنی نفسانیت کو قومیت کے نقاب میں چھپاتے ہیں اور اگرچہ ظاہری طور پر ہمیں ایک نہایت ہی روادارانہ حُب الوطنی کا ادعا ہے لیکن دلوں میں ذات پات کی تنگی اور فرقہ آرائی کی ہوس بدستور کام کر رہی ہے۔ ہم لوگ اس اُصول کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ ہر جماعت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی تہذیب و تمدن کے نشوونما میں آزادی کے ساتھ قدم بڑھائے۔ لیکن ہماری ناکامی کے اسباب کچھ بھی ہوں، میرا دل اب بھی اُمید سے لبریز ہے۔ واقعات کا رُجحان بہرکیف ہمارے

داخلی اتحاد اور اندرونی آہنگی کی جانب ہی نظر آتا ہے اور جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے مجھے یہ اعلان کرنے میں مطلق تامل نہیں کہ اگر فرقہ وارانہ اُمور کے ایک مستقل اور پائیدار تصفیہ کے اس بنیادی اُصول کو تسلیم کر لیا جائے کہ مسلمانانِ ہندوستان کو اپنی روایات اور تمدن کے ماتحت اس ملک میں آزادانہ نشوونما کا حق حاصل ہے تو وہ اپنے وطن کی آزادی کے لئے بڑی سے بڑی قربانی سے دریغ نہ کریں گے۔ یہ اُصول کہ ہر فرد اور ہر جماعت اس امر کی مجاز ہے کہ وہ اپنے عقائد کے مطابق آزادانہ ترقی کرے کسی تنگ نظر فرقہ واریت پر مبنی نہیں۔ فرقہ واریت کی بھی بہت سی صُورتیں ہیں۔ وہ فرقہ واریت جو دوسری قوموں سے نفرت اور ان کی بدخواہی کی تعلیم دے اس کے ذلیل اور ادنیٰ ہونے میں کوئی شُبہ نہیں۔ میں دوسری قوموں کے رسُوم قوانین اور ان کے معاشرتی و مذہبی ادارت کی دل سے عزت کرتا ہوں۔ بلکہ بحیثیت مسلمان میرا یہ فرض ہے کہ اگر ضرورت پیش آئے تو احکام قرآنی کے حسبِ اقتضاء میں ان کی عبادت گاہوں کی حفاظت کروں۔ بایں ہمہ مجھے اس جماعت سے دلی محبت ہے جو میرے اوصاف و اطوار اور میری زندگی کا سرچشمہ ہے اور جس نے اپنے دین اور اپنے ادب، اپنی حکمت اور انسانیت سے بہرہ مند کر کے مجھے وہ کچھ عطا کیا جس سے میری موجودہ زندگی کی تشکیل ہوئی یہ اسی کی برکت ہے کہ میرے ماضی نے از سرِ نو زندہ ہو کر مجھ میں یہ احساس پیدا کر دیا کہ وہ اب بھی میری ذات میں سرگرم کار ہے۔ نہرو رپورٹ کے واضعین تک نے بھی فرقہ واریت کے اسی پہلو کا اعتراف کیا ہے۔ علیحدگی سندھ کے مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے :-

"یہ کہنا کہ قومیت کے وسیع نقطۂ نگاہ کے ماتحت کسی فرقہ وارانہ صوبہ کا قیام مناسب نہیں" بالکل ایسا ہے جیسے یہ دعویٰ کہ بین الاقوامی نصب العین کا تقاضا ہے کہ علیحدہ علیحدہ قوموں کا وجود قائم نہ رہے۔ ان دونوں بیانات میں ایک حد تک صداقت موجود ہے لیکن بین الاقوامی نصب العین کے سرگرم حامیوں کو بھی اس امر کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ قوموں کی پوری کی پوری آزادی کے بغیر کسی بین الاقوامی ریاست کا وجود قائم کرنا مشکل ہے۔ اسی مکمل تمدنی آزادی کے بغیر (اور یاد رکھیئے کہ اپنی ارفع اور اعلیٰ صورت میں فرقہ واریت سوائے تمدن کے کچھ نہیں) ایک ہم آہنگ اور متوازن قوم کا پیدا کرنا ناممکن ہے۔

لہذا ثابت ہؤا کہ ہندوستان میں ایک متوازن اور ہم آہنگ قوم کے نشو ونما کی طرح مختلف ملتوں کا وجود ناگزیر ہے مغربی ممالک کی طرح ہندوستان کی یہ حالت نہیں کہ اس میں ایک ہی قوم آباد ہو وہ ایک ہی نسل سے تعلق رکھتی ہو اور اس کی زبان بھی ایک ہو۔ ہندوستان مختلف اقوام کا وطن ہے جن کی نسل، زبان اور مذہب سب ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ ان کے اعمال اور افعال میں وہ احساس پیدا ہی نہیں ہوسکتا جو ایک ہی نسل کے مختلف افراد میں رہتا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو ہندو بھی تو کوئی واحد اجنسی قوم نہیں۔ پس یہ امر کسی طرح بھی مناسب نہیں کہ مختلف ملتوں کے وجود کا خیال کئے بغیر ہندوستان میں مغربی طرز کی جمہوریت کا نفاذ کیا جائے لہذا مسلمانوں کا مطالبہ کہ ہندوستان میں ایک اسلامی ہندوستان قائم کیا جائے، بالکل حق بجانب ہے۔ میری رائے میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس کی قرار دادوں سے اسی بلند نصب العین کا اظہار ہوتا ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ مختلف ملتوں کے وجود کو فنا کئے بغیر ایک متوافق اور ہم آہنگ قوم تیار کی جائے تاکہ وہ آسانی کے ساتھ اپنے ان ممکنات کو جو ان کے اندر مضمر ہیں عمل میں لا سکیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ اجتماع ان تمام مطالبات کی جو اس قرارداد میں موجود ہیں نہایت شدّ و مد سے تائید کرے گا۔ ذاتی طور پر تو میں ان مطالبات سے بھی ایک قدم آگے بڑھنا چاہتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ایک ہی ریاست میں ملا دیا جائے۔ خواہ یہ ریاست سلطنت برطانیہ کے اندر حکومت خود اختیاری حاصل کرے خواہ اس کے باہر مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ اور نہیں تو شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو آخر ایک منظم اسلامی ریاست قائم کرنا پڑے گی۔ اس تجویز کو نہرو کمیٹی میں بھی پیش کیا گیا تھا لیکن اراکین مجلس نے اسے اس بنا پر رد کر دیا کہ اگر اس قسم کی کوئی ریاست قائم ہوئی تو اس کا رقبہ اس قدر وسیع ہوگا کہ اس کا انتظام کرنا دشوار ہو جائے گا۔ بے شک اگر رقبہ کا لحاظ کیا جائے تو اراکین مجلس کا یہ خیال صحیح ہے۔ لیکن آبادی پر نظر کی جائے تو اس ریاست کے باشندوں کی تعداد اس وقت کے بعض ہندوستانی صوبوں سے بھی کم ہوگی۔ غالباً قسمت انبالہ یا اس قسم کے دوسرے اضلاع کو الگ کر دینے سے جن میں ہندو آبادی کا غلبہ ہے اس کی وسعت اور انتظامی مشکلات میں اور بھی کمی پیدا ہو جائے گی۔ پھر ان اضلاع

کی علیحدگی سے غیر مسلم اقلیتوں کے حقوق کہیں زیادہ ہو جائیں گے۔ اس تجویز کو سن کر نہ انگریزوں کو پریشان ہونا چاہیئے نہ ہندوؤں کو۔ ہندوستان دُنیا میں سب سے بڑا اسلامی مُلک ہے اور اگر ہم چاہتے ہیں کہ اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت کے زندہ رہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایک مخصوص علاقہ میں اپنی مرکزیت قائم کر سکے ہندوستانی مسلمانوں کے اس زندہ اور جاندار طبقہ کی بدولت برطانیہ کی ناانصافیوں کے باوجود فوج اور پولیس میں شریک ہو کر انگریزوں کو اس قابل بنایا ہے کہ وہ اس مُلک پر اپنی حکومت قائم رکھیں۔ ہندوستان کا مسئلہ حل ہو جائے گا بلکہ اس سے خود مسلمانوں کے احساساتِ ذمہ داری قوی ہو جائیں گے اور ان کا جذبۂ حب الوطنی بڑھ جائے گا اگر شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو اس امر کا موقع دیا گیا کہ وہ ہندوستان کے جسدِ سیاسی کے اندر رہ کر اپنے نشوونما میں آزادانہ قدم اٹھا سکیں تو وہ تمام بیرونی حملوں کے خلاف خواہ وہ حملہ بزورِ قوت ہو یا بزورِ خیالات ہندوستان کے بہترین محافظ ثابت ہوں گے پنجاب میں مسلمانوں کی آبادی ۵۶ فی صدی ہے لیکن ہندوستان کی پوری فوج میں ہمارا حصّہ ۵۴ فی صدی ہے اور اگر عساکرِ ہند کی کُل تعداد میں سے ان ۱۹ ہزار گورکھوں کو جو نیپال کی آزاد ریاست سے بھرتی کئے جاتے ہیں نکال دیا جائے تو مسلمانوں کی کل تعداد ۶۱ فی صدی ہو جائے گی۔ حالانکہ اس اندازہ میں وہ ۶ ہزار جنگجو شامل نہیں ہیں جو بلوچستان اور صوبہ سرحد سے بھرتی کئے جاتے ہیں۔ اس سے آپ ان تمام صلاحیتوں کا بہ آسانی اندازہ کر سکیں گے جو شمال مغربی ہندوستان کی مُسلم آبادی میں موجود ہیں اور جن کی بدولت وہ تمام ہندوستان کو غیر ملکی چیرہ دستیوں سے محفوظ اور مامون رکھ سکتے ہیں۔

رائٹ آنریبل مسٹر سری نواس شاستری کا خیال ہے کہ مسلمانوں کا مطالبہ ہے کہ شمال مغربی سرحد کے ساتھ ساتھ خود مختار اسلامی ریاستیں قائم کی جائیں ان کی اس خواہش کا اظہار کرتا ہے کہ اگر ضرورت پیش آئے تو حکومت پر زور ڈالا جا سکے میں یہ عرض کروں گا کہ مسلمانانِ ہندوستان کے دل میں اس قسم کا کوئی جذبہ موجود نہیں ان کا مدعا صرف اس قدر ہے کہ وہ اپنی ترقی کی راہ میں آزادی کے ساتھ قدم بڑھائیں لیکن یہ اس مرکزی حکومت کے ماتحت ممکن نہ ہوگا جسے قوم پسند ہندو ارباب سیاست محض اس لئے قائم کرنا چاہتے ہیں کہ ان کو دوسری ملتوں پر ہمیشہ کے لئے غلبہ ہو جائے۔

بہر حال ہندوؤں کے دل میں اس قسم کا خدشہ نہیں ہونا چاہیئے کہ آزاد اسلامی ریاستوں کے قیام سے ایک طرح کی مذہبی حکومت قائم ہو جائے گی۔ میں ابھی عرض کر چکا ہوں کہ اسلام میں مذہب کا مفہوم کیا ہے۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ اسلام کوئی کلیسائی مذہب نہیں بلکہ ایک ریاست ہے جس کا اظہار دو سو سال سے بھی کہیں بیشتر ایک ایسے وجود میں ہوا جو عقد اجتماعی کا پابند ہو۔ ریاست اسلامی کا انحصار ایک اخلاقی نصب العین پر ہے جس کا یہ عقیدہ ہے کہ انسان شجر و حجر کی طرح کسی خاص زمین سے وابستہ نہیں۔ بلکہ وہ ایک رُوحانی ہستی ہے جو ایک اجتماعی ترکیب میں حصّہ لیتا ہے اور اس کے ایک زندہ جُزو کی حیثیت سے چند فرائض اور حقوق کا مالک ہے۔ اسلامی ریاست کی نوعیت کا اندازہ "ٹائمز آف انڈیا" کے اس افتتاحیہ سے کیا جا سکتا ہے جس میں لکھا ہے کہ قدیم ہندوستان میں ریاست کا یہ فرض تھا کہ سُود کے متعلق قوانین بنائے۔ لیکن باوجود اس کے کہ اسلام میں سُود لینا حرام ہے۔ اسلامی ریاست نے شرح سود پر کوئی پابندیاں عائد نہیں کیں۔ میں صرف ہندوستان اور اسلام کے فلاح و بہبود کے خیال سے ایک منظم اسلامی ریاست کے قیام کا مطالبہ کر رہا ہوں۔ اس سے ہندوستان کے اندر توازن قوت کی بدولت امن و امان قائم ہو جائے گا اور اسلام کو اس امر کا موقع ملے گا کہ وہ ان اثرات سے آزاد ہو کر جو عربی شہنشاہیت کی وجہ سے اب تک اس پر قائم ہیں، اس جمود کو توڑ ڈالے جو اس کی تہذیب اور تمدن شریعت اور تعلیم پر صدیوں سے طاری ہے۔ اس سے نہ صرف ان کے صحیح معنی کی تجدید ہو سکے گی بلکہ وہ زمانہ حال کی رُوح سے بھی قریب تر ہو جائیں گے۔ میرے خیال میں اب یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو گئی ہے کہ ہندوستان کے تمدن اور عقائد و معاشرت کے بے شمار اختیارات کو مدّنظر رکھتے ہوئے ایک مستقل حکومت قائم کرنے کی یہی صورت ہے کہ یہاں ایسی آزاد ریاستیں قائم کر دی جائیں جو زبان، نسل، تاریخ، مذہب اور اقتصادی مفاد کے اشتراک پر مبنی ہوں۔"

حضرت علامہ کا یہ خطبہ گہری سوچ بچار کا نتیجہ تھا۔ انہوں نے مسلمانوں کے مطالبات اور جذبۂ قومیت کا تجزیہ احسن پیرائے میں کیا۔ سترہ برس بعد یہی پاکستان کی نظریاتی اساس کی صورت اختیار کر گیا۔ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوؤں نے تو انگریزوں

کے ساتھ مفاہمت کرلی۔ لیکن مسلمان دونوں کے تشدد کا نشانہ بنے دونوں نے انہیں سیاسی معاشرتی، تعلیمی اور اخلاقی اعتبار سے نیست و نابود کرنے کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ ۱۸۸۵ء میں انگریزوں کے ایماء پر آل انڈین نیشنل کانگریس کا قیام ایک انگریز اے او ہیوم کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں کانگریس نے ہندوستانی یا متحدہ قومیت کا نعرہ بلند کیا۔ وہ متحدہ قومیت کی آڑ میں مسلمانوں کو اپنے اندر ضم کر کے رام راج کے منصوبے تیار کرنے لگی۔ سر سید احمد خان اور سید امیر علی ایسے مسلمان زعماء نے مسلمانوں کے انفرادی تشخص کو ابھارنے اور دو قومی نظریہ کی تخم ریزی کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

اب مفکرِ مشرق نے ایک علیحدہ مسلم مملکت کا تصور پیش کیا تو سیاست میں ایک نیا باب کھل گیا۔ اس وقت مسلم ہندوستان ایک عظیم بحران سے دوچار تھا۔ مسلمان ایک کُل ہند فیڈریشن کے تصور کے ساتھ پنجاب کی تقسیم کے متعلق بھی سوچ نہ سکتے تھے چہ جائیکہ مسلم اکثریت کے مختلف صوبوں پر مشتمل ایک علیحدہ مملکت کے قیام کا مطالبہ کرتے۔ سنہ ۱۹۲۵ء میں لالہ جپت رائے نے صوبوں کی نئی حدبندی کا سوال اٹھایا تھا لیکن مسلمانوں کے مطالبات کے الزامی جواب کے طور پر اُن کا استدلال یہ تھا کہ اگر مسلمان "ہندوستانی قومیت" کی راہِ راست پر چلنے کو تیار نہیں ہوتے اور مسلم صوبوں اور ہندو صوبوں کے ذریعے ہندو مسلم توازنِ اقتدار کا تصور ترک نہیں کرتے تو پھر پورے پنجاب اور پورے بنگال کو مسلم اکثریت کے ماتحت کرنے کا کوئی جواز نہیں اس صورت میں لالہ جی کے نزدیک تر ین انصاف بات یہ تھی کہ مسلمان پنجاب اور بنگال کے صرف ان حصوں پر قناعت کریں جہاں ان کی اکثریت ہے۔ اپنے چار صوبے اس طرح بنا لیں، صوبہ سرحد، مغربی پنجاب، سندھ اور مشرقی بنگال لیکن (آپ نے فرمایا) یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ طریقہ ہندوستان کو متحد رکھنے کا نہیں ہے بلکہ اسے مسلم انڈیا اور ہندو انڈیا میں تقسیم کرنے کا ہے[لہ]"

اسی دوران میں لندن میں گول میز کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا جس میں مسلم

لہ: مارشل لاء سے مارشل لاء تک، ص ۱۲۶ سید نور احمد - سید نور احمد، کونسز روڈ لاہور ۱۹۶۶ء

مندوبین کو متحدہ اینگلو ہندو محاذ کا سامنا تھا۔ اسی لئے وہ بددل ہو چکے تھے کیونکہ ہندو نواز لیبر حکومت کے سربراہ رمیزے میکڈونلڈ اور ہندو قیادت کے مابین خفیہ معاہدے طے پا چکا تھا۔ جس کا مقصد ایک مضبوط مرکز کا قیام تھا اور اس منزل تک پہنچنے کے لئے والیانِ ریاست کو وفاق میں شامل کرنے کا منصوبہ بنایا گیا تھا۔ مسلم مندوبین زیادہ سے زیادہ صوبائی خود مختاری، کمزور مرکز، پنجاب اور بنگال میں مسلم اکثریت کا مانا جانا سندھ کی بمبئی سے علیحدگی، شمال مغربی سرحدی صوبے اور بلوچستان میں اصلاحات کا نفاذ اور جداگانہ طریق انتخابات کا حق وکالت لے کر آئے تھے۔ یہ وہ حالات تھے کہ حضرت علامہ نے الہ آباد میں اپنا خطبہ صدارت دے کر حالات کا دھارا تبدیل کر دیا یہ خطبہ انگریزوں اور ہندوؤں کے لئے ایک دھماکہ تھا۔ مسٹر الیف ڈبلیو ولسن بمبئی کے "انڈین ڈیلی میل" کا نمائندہ مقیم لندن نے اپنے ۳۱ دسمبر ۱۹۳۰ء کے مراسلے میں لکھا کہ "مسٹر رمیزے میکڈونلڈ اقبال کے بیان کردہ خیالات سے سخت ناراض ہیں" ہندوستان کے مشہور ہندو راہنما اور بنارس یونیورسٹی کے بانی پنڈت مدن موہن مالویہ نے اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا :-

"اقبال سے پہلے ہم یہ بات محسوس نہیں کر سکتے تھے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا الگ وجود بھی ہے۔ ہم انہیں متحدہ قومیت کا جزو سمجھتے تھے"

لاہور کے "ٹریبون" نے یکم جنوری ۱۹۳۱ء کی اشاعت میں اسے اقبال کی انتقام جوئی سے تعبیر کیا کیونکہ انہیں گول میز کانفرنس کے حالیہ اجلاس میں مدعو نہیں کیا گیا تھا۔ اخبار نے مزید لکھا کہ اقبال نے ایسا کر کے فرقہ وارانہ تصفیے کی تمام راہیں مسدود کر دی ہیں کیونکہ انہوں نے لندن میں مسلم مندوبین کو مشترکہ انتخابات کے اصول کی مشروط منظوری کے خلاف احتجاجی تار دیا اور پھر الہ آباد میں اس نوع کا خطبہ دے ڈالا۔

"لیڈر" جو الہ آباد سے ہی شائع ہوتا تھا نے ۴ جنوری ۱۹۳۱ء کے شمارے میں ایک خط شائع ہوا۔ جو لندن سے بھیجا گیا تھا۔ اس خط میں برطانوی اور ہندی حلقوں (مقیم لندن) کی ناراضی کا ذکر تھا۔ حضرت علامہ کی مخالفت میں "ٹائمز آف انڈیا" اور "پوائنیر" بھی پیش پیش تھے "پرتاب" نے اپنے ایک اشاعیہ کا عنوان یہ لگایا "شمالی ہند کا ایک خطرناک مسلمان"۔

حضرت اقبال کے کئی دوست ہندو تھے جن میں سر جوگندر سنگھ اور حیدر آباد دکن کے مدار المہام سر کشن پرشاد سرفہرست ہیں، اول الذکر کا تو انہوں نے اپنے شعر میں ذکر کر کے اُنہیں زندہ جاوید بنا دیا ہے ؎

کیسے پتے کی بات جوگندر نے کل کہی
موٹر ہے ذوالفقار علی خاں کا کیا خاموش

شاعرِ مشرق کی رحلت پر جوگندر بچوں کی طرح بلک بلک کر روئے اور اُسے اپنا عظیم ذاتی نقصان قرار دیا[1]۔ ان کے مداح سراہوں میں ایک سر تیج سُپرو بھی تھے جنہوں نے حضرت علامہ کو "ایک ایسا شاعر قرار دیا جو کسی بھی عظیم شخص کے ہم پلہ ہو سکتا ہے"، کئی ہندو مصنفین نے شاعرِ مشرق پر سیر حاصل کتب لکھی ہیں جن میں اُن کی شاعری کو موضوعِ سخن بنایا گیا ہے لیکن اُن کے نظریہ وطنیت کے متعلق یا تو خاموشی اختیار کی گئی یا اس پر تنقید کی گئی ہے۔ ڈاکٹر سنہا نے اُنہیں مفکر کی نسبت عظیم شاعر تسلیم کیا ہے اور لکھا ہے کہ "اقبال کی فلاسفی نہ ہندوستانی ہے اور نہ مسلم"۔ خود مسلمان سیاستدان حضرت علامہ کے اس تصور پر جز بز ہوئے اور اس کا تمسخر اُڑایا۔ قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ وہ واحد راہنما تھے جنہوں نے ہندوستان کی مخصوص ثقافتی اور سیاسی صورت حال کا بنظر عائر مطالعہ کیا اور حضرت علامہ کے اخذ کردہ نتائج کو قبول کر لیا اور فرمایا کہ۔

"میرے اور مرحوم کے خیالات میں کاملاً ہم آہنگی پائی جاتی ہے، ہندوستان کے دستوری مسائل کے گہرے مطالعہ کے بعد انجام کار مجھے بھی نتائج اخذ کرنے پڑے اور بالآخر انہی خیالات نے مسلم ہندوستان کے متحدہ عزم کی صورت میں جنم لیا جس کو کل ہند مسلم لیگ کے اجلاس لاہور منعقدہ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کی تجویز میں متشکل کیا گیا جو عام طور پر قرار دادِ پاکستان کے نام سے موسوم ہے"

یہ حضرت علامہ کا پیش کردہ تصور ہی تھا جس کی روشنی میں قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ

---

[1] ملاحظہ کریں اُن کا مضمون: A Friend's Memoir in the Civil and Military Gazette, Lahore, 29th November, 1938.

کی غیر متزلزل سیادت کے باعث پاکستان معرضِ وجود میں آیا۔ یہاں اس الزام کا ذکر برمحل معلوم ہوتا ہے کہ علامہؒ اقبال بعد میں اپنے موقف سے منحرف ہو گئے تھے۔

مسٹر ایڈورڈ تھامسن نے اپنی کتاب Enlist India For Freedom میں لکھا ہے

"کئی سال تک اس قسم کی آوازیں سنائی دیتی رہی ہیں کہ ایک اسلامی مملکت ہندوستان سے الگ ہو کر قائم کی جائے۔ یہ امر متنازعہ فیہ رہا ہے کہ آخر یہ تجویز سب سے پہلے کس نے پیش کی۔ عام طور پر اس سلسلے میں علامہ اقبال کا نام لیا جاتا ہے۔ "آبزرور" میں ایک دفعہ میں نے لکھا تھا کہ اقبال نے پاکستان کی وسیع و عریض سرزمین پر بھوک افلاس اور بے تنظیمی و انتشار کے بحران پر اپنی پریشانی اور مایوسی کا اظہار کرنے کے بعد اقبال نے کہا تھا۔ میرا خیال ہے کہ پاکستان کا منصوبہ برطانوی حکومت کے لئے تباہ کن ثابت ہوگا۔ ہندوؤں کے لئے تباہ کن ہوگا اور مسلمانوں کے لئے بھی تباہ کن ہوگا لیکن میں مسلم لیگ کا صدر ہوں اس لئے اس تجویز کی حمایت کرنا میرا فرض ہے۔"[1]

مسٹر ایڈورڈ تھامسن نے ایک اور مقام پر اسی کتاب میں "ایک ملک میں دو قوموں" کی حکومت کے نتائج پر قائداعظم کے ساتھ اپنی کسی گفتگو کا تذکرہ اس طرح کیا ہے:۔

"مسٹر جناح! دو قومیں — جن کا ہر صوبے، ہر شہر اور ہر گاؤں میں ایک دوسرے سے مقابلہ ہے؟"

"ہاں دو قومیں — جن کا ہر صوبے، ہر شہر اور ہر گاؤں میں ایک دوسرے سے مقابلہ ہے۔ اس مسئلے کا یہی ایک حل ہے۔"

"مسٹر جناح! یہ بڑا خوفناک حل ہے۔"

"خوفناک تو ہے۔ مگر یہی واحد حل ہے۔"

امر واقعہ یہ ہے کہ حضرت علامہ اور قائداعظم محمد علی جناحؒ سے یہ بیانات منسوب

---

[1]:۔ ایڈورڈ تھامسن نے حضرت علامہ کے جو الفاظ اپنی کتاب میں درج کئے ہیں، وہ یہ ہیں:۔

"But I am the president of the Muslim League and thereforeit is my duty to support it."

کئے۔ گئے۔ مسٹر ایڈورڈ تھامسن آکسفورڈ میں بنگلہ زبان کے پروفیسر تھے انہوں نے "مانچسٹر گارڈین" کے نامہ نگار کی حیثیت سے برّصغیر کا دو دفعہ دورہ کیا تھا۔ یہ راز اب کوئی راز نہیں کہ اُن کے گاندھی، پنڈت نہرو اور سردار پٹیل کے ساتھ گہرے تعلقات تھے جن کے پیشِ نظر انہوں نے یہ من گھڑت بیانات تراشے۔ جب قائداعظمؒ کی توجہ اس بیان کی طرف دلوائی گئی تو انہوں نے فوراً اس کی تردید کی۔ لیکن جو ذہن اس سازش کے پیچھے کارفرما تھا اس کی عکاسی اس امر سے ہو جاتی ہے کہ آنجہانی پنڈت نہرو نے اپنی کتاب Discovery of India اور آنجہانی ڈاکٹر بابو راجندر پرشاد نے اپنی کتاب India Divided میں ان بیانات کو قبول کیا ہے۔ اگرچہ مسٹر ایڈورڈ تھامسن کی کتاب حضرت علامہؒ کی وفات کے بعد منظرِ عام پر آئی لیکن اُن کے بیان کی تردید حضرت علامہ کے اُس بیان سے بھی ہو سکتی ہے جو انہوں نے ۲۱ مارچ ۱۹۳۲ء کو کل ہند مسلم کانفرنس میں دیا۔ لاہور کی اس کانفرنس میں اُنہوں نے اپنے صدارتی خطبے میں قومیت کے جدید نظریئے کی ان الفاظ میں دھجیاں اُڑائیں۔

"میں یورپی تصوّرِ وطنیت کا مخالف ہوں۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ اس سے مسلمانوں کو کم تر مادی فوائد حاصل ہوں گے بلکہ اس لئے کہ اس میں مُنکرِ خدا مادیت کے جراثیم پائے جاتے ہیں جسے میں جدید انسانیت کے لئے عظیم ترین خطرہ سمجھتا ہوں۔"

تحریک پاکستان کے ابتدائی دور میں باڑہ ہندو راؤ دہلی کے ایک جلسہ عام میں مشہور عالمِ دین مولانا حسین احمد مدنیؒ نے اپنی تقریر میں یہ ارشاد فرمایا کہ "قومیں اوطان سے بنتی ہیں" یعنی ہر قوم کو اُس کے وطن کی نسبت سے ہی پکارا جاتا ہے، جیسے افغانی قوم، ایرانی قوم، فرانسیسی قوم اور برطانوی قوم وغیرہ۔ مولانا مدنی کا یہ ارشاد اسلامی روح کے منافی تھا۔ اس لئے حضرت علامہ نے فرمایا کہ

عجم ہنوز نہ داند رموز دیں ورنہ — زدیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی ست
سرود برسرِ منبر کہ ملت از وطن است — چہ بے خبر ز مقام محمدؐ عربی ست
بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست — اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی ست

حضرت علامہ کو اس بات کا بڑا قلق تھا کہ مولانا مدنیؒ یہ سمجھتے تھے کہ اسلام میں قوم اور ملّت دو الگ الگ وجود ہیں۔ اقبالؒ کا خیال تھا کہ اسلام بنائے قومیت ہے اور اس کا

سرچشمہ رسالت ہے جیسا کہ "رموز بے خودی" میں رسالت کے عنوان تلے فرمایا کہ ع

از رسالت در جہاں تکوینِ ما

پھر فرمایا ؎

از عقیدہ قومیت مُسلم کشود

از وطن آقائے ما ہجرت نمود

علامہ مرحوم کو اس بات کا بڑا دُکھ تھا اور وہ اپنی ہر نشست میں اسی بات کو موضوعِ سخن بناتے تھے۔ جناب سیّد نذیر نیازی نے ایک نشست منعقدہ ۷ مارچ ۱۹۳۸ء کا احوال اس طرح بیان کیا ہے کہ حضرت علامہ نے فرمایا [۱]

" ارباب دیوبند اگر ماضی ہی پر نظر ڈالیں تو ان کے لئے یہ سمجھنا مشکل نہیں ہوگا کہ کانگرس نے آج سے پچیس سال پہلے جس آئینی جدوجہد کی ابتداء کی تھی، آزادیٔ ہند کا مطالبہ اسی جدوجہد کی مرحلہ بہ مرحلہ کامیابی کی آخری شکل ہے۔ لیکن اس کی رُوح اور اساس وہی ہے جس کے پیشِ نظر سرسیّد نے ہمیں مشورہ دیا تھا کہ ہم کانگرس سے الگ رہیں۔ کانگرس میں شرکت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم نے اسی فرضی اور خیالی یعنی ہندوستانی قومیت کا وجود تسلیم کر لیا ہے جو دراصل ہندو قومیت ہی کا ایک دوسرا نام ہے، ہندوستانی قومیت کا اقرار اُمت کے جُداگانہ وجود کا انکار ہے۔"

پھر فرمایا :-

" مسلمانوں کے لئے اس وقت دو خطرے ہیں۔ ایک جغرافی قومیت، دوسرا وحدتِ اُمت کی نفی۔ پہلا خطرہ مغرب کے الحاد پرور خیالات، مغربی تہذیب و تمدن کے اثر و نفوذ اور نئی تعلیم کا پیدا کردہ ہے، جسے کانگرس کی لادین سیاست طرح طرح سے ہوا دے رہی ہے اور جس کا بعض علماء انگریز دشمنی کے فریب میں نادانستہ خیر مقدم کر رہے ہیں۔ دوسرا قادیانیت کی طرف سے ہے۔ ایک کی اساس لامذہبیت ہے دوسرے کی مذہب۔ قادیانیت اُمت سے کٹ چکی ہے جس کا شاید اُسے خود بھی شعور نہیں،

---

[۱]:۔ اقبالؒ کے حضور نشستیں اور گفتگوئیں جز اوّل ص ص ۲۹۲، ۲۹۵ — ۲۹۶ سیّد نذیر نیازی اقبال اکادمی کراچی جولائی ۱۹۷۱ء

اور ہے بھی تو بابیت اور بہائیت کے پیشِ نظر اس کے نزدیک مصلحت اسی میں ہے کہ اُمت سے اپنا کوئی رشتہ قائم رکھے۔"

حضرت علامہ علماء کرام کی تہ دل سے عزت کرتے تھے لیکن اس مسئلہ پر انہیں یہاں تک کہنا پڑا ؎

قوم کیا چیز ہے، قوموں کی امامت کیا ہے
اس کو کیا سمجھیں، یہ بیچارے دو رکعت کے امام

مولانا حسین احمد مدنیؒ کے مؤقف کے ابطال کے لئے حضرت علامہ نے ایک نہایت ہی مدلل مضمون لکھا اور بحث کے لئے تین عنوان مقرر فرمائے، علامہ مرحوم کے اپنے الفاظ میں سُنیئے :-

۱- کیا مسلمان بحیثیت اجتماعی واحد و متحد اور معروف جماعت ہے جس کی اساس و بنیاد توحید اور ختم نبوت کے عقیدہ پر ہے یا کوئی ایسی جماعت ہے جو نسل و رنگ و ملک و زبان کے مقتضیات کے تحت اپنی ملّی وحدت چھوڑ کر کسی اور نظام و قانون کے تحت کوئی اور ہیئت اجتماعیہ بھی اختیار کر سکتے ہیں۔

۲- کیا ان معنوں میں قرآن حکیم نے اپنی آیات میں مسلمانوں کو لفظ قوم سے تعبیر کیا ہے یا صرف لفظ ملّت و اُمت ہی سے پکارا ہے۔

۳- اس ضمن میں وحی الٰہی کی دعوت کس لفظ کے ساتھ ہے۔ کیا یہ کہیں آیاتِ قرآنی میں آیا ہے کہ اے مومنو! یا اے لوگو! قوم مسلم میں شامل ہو جاؤ یا اس کا اتباع کرو۔ یا یہ دعوت صرف ملّت کے اتباع اور اُمت میں شمولیت کی ہے؟

"جہاں تک میں سمجھ چکا ہوں قرآنِ حکیم میں جہاں جہاں اتباع و شرکت کی دعوت ہے وہاں صرف لفظ "ملت" یا اُمت وارد ہوتا ہے۔ کسی خاص قوم کے اتباع یا اس میں شرکت کی دعوت نہیں۔ مثلاً ارشاد ہوتا ہے:

ترجمہ:- "اُس شخص سے دین میں بہتر کون ہے جس نے اپنا منہ اللہ کی طرف کیا اور نیکی کرنے والا اور ملّت ابراہیم حنیف کی پیروی کرنے والا ہے۔"

ترجمہ:- اور میں نے اپنے آباء ابراہیم کی ملت کی پیروی کی۔

اور یہ اتباع و اطاعت کی دعوت اس لئے ہے کہ ملت نام ہے ایک دین کا۔

ایک شرع و منہاج کا۔ قوم چونکہ کوئی شرع و دین نہیں، اس لئے اس کی طرف دعوت اور اس سے تمسک کی ترغیب محض عبث تھی۔ کوئی گروہ خواہ وہ قبیلہ کا ہو نسل کا ہو، ڈاکوؤں کا ہو، تاجروں کا ہو، ایک ملک یا وطن والوں کا ہو وہ محض گروہ ہے رجال کا یا انسانوں کا۔ وحی الٰہی یا نبی کے نقطہ خیال سے بھی وہ گروہ ہدایت یافتہ نہیں ہوتا۔ اگر وحی یا نبی اس گروہ میں آئے تو وہ گروہ اس کا پہلا مخاطب ہوتا ہے اس لئے وہ اس کی طرف منسوب بھی ہوتا ہے مثلاً قوم نوح، قوم موسیٰ، قوم لوط لیکن اگر اسی گروہ کا مقتدا کوئی بادشاہ یا سردار ہو تو وہ گروہ اس کی طرف بھی منسوب ہوگا۔ مثلاً قوم عاد، قوم فرعون۔ اگر ایک ہی دو گروہ یکجا ہو جائیں اور اگر وہ متضاد قسم کے رہناؤں کے گروہ ہوں تو وہ دونوں سے منسوب ہو سکتے ہیں مثلاً جہاں قوم موسیٰ تھی جہاں قوم فرعون بھی تھی۔

ترجمہ:۔ "قوم فرعون کے سرداروں نے سوال کیا کہ کیا تو موسیٰ اور اس کی قوم کو چھوڑ دیتا ہے"

لیکن ہر مقام پر جہاں قوم کہا گیا وہاں وہ گروہ عبارت تھا جو ہدایت یافتہ اور غیر ہدایت یافتہ سب افراد پر مشتمل تھا جو افراد پیغمبرؑ کی اطاعت میں آتے گئے توحید الٰہی تسلیم کرتے گئے وہ پیغمبرؑ کی ملّت میں آ گئے۔ اُس کے دین میں آ گئے یا واضح تر الفاظ میں مسلم ہو گئے۔ یاد رہے کہ دین اور ملّت کفار کی بھی ہو سکتی ہے۔

ترجمہ:۔ میں نے اُس قوم کی ملّت کو چھوڑ دیا ہے جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے۔

ایک قوم کی ایک ملّت یا اس کا منہاج تو ہو سکتا ہے لیکن ملّت کی قوم کہیں نہیں آیا۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ خدا نے قرآن میں ایسے افراد کو جو مختلف اقوام و ملل سے نکل کر ملّتِ ابراہیمی میں داخل ہو گئے۔ ان کو داخل ہونے کے بعد لفظ قوم سے تعبیر نہیں فرمایا، بلکہ اُمت کے نام سے مخاطب کیا ہے۔

ان گذارشات سے میرا مقصد و مطلب یہ ہے کہ جہاں تک میں دیکھ سکا ہوں قرآنِ کریم میں مسلمانوں کے لئے اُمت کے علاوہ اور کوئی لفظ نہیں آیا۔ قوم رجال کی جماعت کا نام ہے اور یہ جماعت بہ اعتبار رنگ، نسل، قبیلہ، زبان، وطن اور اخلاق ہزار جگہ اور ہزار رنگ میں پیدا ہو سکتی ہے لیکن ملّت تمام جماعتوں کو تراش کر ایک نیا اور مشترک گروہ بنائے گی۔ گویا ملّت یا اُمت اقوام کی جاذب ہے خود ان

ان میں جذب نہیں ہو سکتی۔ کون نہیں جانتا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سب سے پہلے وہ پیغمبر تھے جن کی وحی میں قوموں، نسلوں اور وطنوں کو بالائے طاق رکھا گیا۔ بنی نوع آدم کی طرف ایک تقسیم کی گئی موحد و مشرک اس وقت سے لے کر دو ہی ملتیں دنیا میں آباد ہیں۔ تیسری کوئی ملت نہیں۔ کعبۃ اللہ کے محافظ آج دعوت ابراہیمی اور دعوت اسماعیلی سے غافل ہو گئے۔ قوم اور قومیت کی ردا اوڑھنے والوں کو اس ملت کے بانیوں کی وہ دعا یاد نہیں جو اللہ کے گھر کی بنیاد رکھتے وقت ان دونوں پیغمبروں نے کی تھی۔

ترجمہ:۔ "جب ابراہیم و اسمٰعیل خانہ کعبہ کی بنیادیں اٹھا رہے تھے (دعائیں مانگ رہے تھے) اے ہمارے پروردگار ہم سے یہ خدمت قبول کر، بے شک تو ہی سننے اور جاننے والا ہے۔ اور اے ہمارے پروردگار ہم کو اپنا فرماں بردار بنا۔"

کیا خدا کی بارگاہ سے اُمتِ مسلمہ کا نام رکھوانے کے بعد بھی یہ گنجائش باقی تھی کہ آپ کی ہیئت اجتماعی کا کوئی حصہ عربی، ایرانی، افغانی، انگریزی، مصری یا ہندی قومیت میں جذب ہو سکتا ہے۔ اُمت مسلمہ کے مقابلہ میں تو صرف ایک ہی ملت ہے اور وہ الکفرۃ ملت واحدہ کی ہے۔

ایک اور لطیف نکتہ بھی مسلمانوں کے لئے قابلِ غور ہے اگر وطنیت کا جذبہ ایسا ہی اہم اور قابلِ قدر تھا تو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض اقارب اور ہم نسلوں اور ہم قوموں کو آپ سے پرخاش کیوں ہوئی؟ کیوں نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کو محض ایک ہمہ گیر ملت سمجھ کر بلحاظ قوم یا قومیت ابوجہل یا ابولہب کو اپنا بنائے رکھا اور ان کی دلجوئی کرتے رہے بلکہ کیوں نہ عرب کے سیاسی اُمور میں ان کے ساتھ قومیت وطنی قائم رکھی۔ اگر اسلام سے مطلق آزادی مراد تھی تو آزادی کا نصب العین تو قریشِ مکہ کا بھی تھا مگر افسوس آپ اس نکتہ پر غور نہیں فرماتے کہ پیغمبر خدا کے نزدیک اسلام دینِ قیم اور اُمتِ مسلمہ کی آزادی مقصود تھی۔ ان کو چھوڑ کر یا ان کو کسی دوسری ہیئتِ اجتماعیہ کے تابع رکھ کر کوئی اور آزادی چاہنا بے معنی تھا۔ ابوجہل اور ابولہب اُمتِ مسلمہ

ہی کو آزادی سے پھولتا پھلتا نہیں دیکھ سکتے تھے کہ بطور مدافعت ان سے نزاع درپیش آتی۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی قوم آپ کی بعثت سے پہلے قوم تھی اور آزاد تھی لیکن جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت بننے لگی تو اب قوم کی حیثیت ثانوی رہ گئی۔ جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت میں آ گئے وہ خواہ ان کی قوم سے تھے یا دیگر اقوام سے وہ سب ملّتِ مُسلمہ اور اُمتِ محمدیہ بن گئے پہلے وہ ملک و نسب کے گرفتار تھے اب ملک و نسب ان کا گرفتار ہو گیا ؎

کسے کو پنجہ زد ملک و نسب را　　　　زداند نکتہ دینِ عرب را
اگر قوم از وطن بودے محمدؐ　　　　ندا دے دعوت دیں بولہب را

حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے یہ بات آسان تھی کہ آپ ابولہب یا ابوجہل یا کفارِ مکہ سے یہ فرماتے کہ تم اپنی بُت پرستی پر قائم، ہم اپنی خدا پرستی پر قائم رہتے ہیں۔ مگر اس وطنی اور نسلی اشتراک کی بنا پر جو ہمارے اور تمہارے درمیان موجود ہے ایک وحدتِ عربیہ قائم کی جاسکتی ہے۔ اگر حضور (نعوذ باللہ) یہ راہ اختیار کرتے تو اس میں شک نہیں یہ راہ ایک وطن دوست کی راہ ہوتی لیکن نبی آخر الزماںؐ کی راہ نہ ہوتی۔ نبوت محمدیہ کی غایت الغایات یہ ہے کہ ایک ہئیت اجتماعیہ انسانیہ قائم کی جائے جس کی تشکیل اس قانونِ الٰہی کے تابع ہو جو نبوت محمدیہ کو بارگاہِ الٰہی سے عطا ہوا ہے یا بالفاظ دیگر یوں کہئے کہ بنی نوع انسان کی اقوام کے باوجود شعوب و قبائل اور الوان و السنہ کے تسلیم کر لینے کے ان کو ان تمام آلودگیوں سے منزہ کیا جائے جو زمان و مکان وطن، قوم، نسل، نسب، ملک وغیرہ کے ناموں سے موسوم کی جاتی ہیں اور اس طرح اس پیکر خاکی کو وہ ملکوتی تخیل عطا کیا جائے جو اپنے وقت کے ہر لحظہ میں ابدیت سے ہمکنار رہتا ہے۔ یہ ہے مقامِ محمدی، یہ ہے نصب العین ملتِ اسلامیہ کا۔

انسان کی تاریخ پر نظر ڈالو ایک لامتناہی سلسلہ ہے باہم آویزیوں کا۔ خون ریزیوں کا اور خانہ جنگیوں کا۔ کیا ان حالات میں عالم بشری میں ایک ایسی ملت قائم ہو سکتی ہے جس کی اجتماعی زندگی امن و سلامتی پر موسس ہو۔ قرآن حکیم کا جواب ہے کہ ہاں ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ توحید الٰہی کو انسانی فکر و عمل میں

حسب منشائے الٰہی مشہور کرنا انسان کا نصب العین قرار پائے۔ ایسے نصب العین کی تلاش اور اس کا قیام سیاسی مدبّر کا کرشمہ نہ سمجھئے بلکہ یہ رحمت للعالمین کی ایک شان ہے کہ اقوام بشری کو ان کے تمام خود ساختہ تفوقوں اور فضیلتوں سے پاک کر کے ایک ایسی اُمت کی تخلیق کی جائے جس کو اُمتِ مُسلمتہ کہہ سکیں اور اس کے فکر و عمل پر شہداء علی الناس کا خدائی ارشاد صادق آسکے۔"

اس مضمون میں علامہ اقبال نے ارشاد فرمایا ؎

قلندر جز دو حرفِ لا الٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہِ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا

حضرت علامہ اس بحران سے بخوبی آگاہ تھے جس کی جانب اسلام کو تیزی سے دھکیلا جارہا تھا مغلیہ سلطنت کی تباہی و بربادی کے بعد مسلمان ایک عظیم جدوجہد کی اُلجھن میں گرفتار تھے۔ افغان ہلاکت آفرین جنگوں میں مصروف تھے، ترکستان عالمی ڈپلومیسی کا اکھاڑہ بن چکا تھا۔ ایران میں بیرونی اثرات نے تنزّل کے عمل کو تیز تر کر دیا تھا اور معاشرتی و مذہبی ابتری نئی قوتوں کو جنم دے رہی تھی۔ عثمانیہ سلطنت گھریلو بدنظمی اور بیرونی سازشوں کا شکار ہو چکی تھی۔ مصر کی حالت بھی دگرگوں تھی۔

ان حالات میں حضرت علامہ مسلمانوں کے لہو کو اپنے کلام سے گرمایا اور اپنے فکر کو حکیمانہ انداز میں پیش کیا۔ ان دنوں نوجوانانِ اسلام کا کردار گر چکا تھا اور مذہب ایک ایسی سطحی جماعت کو تحریک نہ دے سکا جو مصنوعی تقوٰی کی مالک تھی۔ شاعرِ مشرق کا پیغام اخلاقی حمایت اور قوت کا ایک نیا منبع تھا انہوں نے جس جذبہ اور محبّت سے دِلّی، بغداد، سسلی اور ہسپانیہ کو یاد کیا اور جو عشق اُن کے دل میں مسلمانوں کے جاہ و جلال اور علم و ہُنر کا تھا اُسی نے ان کی زبان سے کہلوایا کہ ؎

نِکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو اُلٹ دیا تھا
سُنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

پھر ارشاد ہوا ہے ؎

غلغلوں سے جس کے لذت گیر اب تک گوش ہے
کیا وہ تکبیر اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہے

حضرت علامہ کا یہی شعر تھا جس نے انہیں گنگا کی پوتر لہروں سے ہٹا کر چاہِ زمزم دکھایا تھا۔ یہی وہ درد تھا جس نے مرحوم کو وطنی ترانوں سے ہٹا کر خالص ملّی ترانوں کی طرف مائل کر دیا۔

۱۹۳۸ء میں حضرت علامہ نے سالِ نو کا پیغام دیتے ہوئے ہسپانیہ کے باشندوں کے اختلافات کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا:۔

"اہلِ ہسپانیہ ایک زبان، ایک مذہب اور ایک قوم رکھنے کے باوجود محض اقتصادی مسائل میں اختلاف رکھنے پر ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہے ہیں اور اپنے ہاتھوں اپنے تمدن کا نام و نشان مٹا رہے ہیں"

اس ایک واقعہ سے صاف ظاہر ہے کہ قومی وحدت بھی ہرگز قائم و دائم نہیں وحدت صرف ایک ہی معتبر ہے اور وہ رنگ، نسل اور زبان سے بالاتر ہے جب تک اس نام نہاد جمہوریت اور اس ناپاک قوم پرستی اور اس ذلیل ملوکیت کو مٹایا نہ جائے گا، جب تک انسان عمل کے اعتبار سے الخلق عیال اللہ کے اصول کا قائل نہ ہو جائے گا، جب تک جغرافیائی وطن پرستی اور رنگ و نسل کے امتیازات کو کلی طور پر فنا نہ کر دیا جائے گا اس وقت تک انسان اس دنیا میں فلاح و سعادت کی زندگی بسر نہ کر سکے گا اور اخوت و حریت اور مساوات کے شاندار الفاظ شرمندۂ معنی نہ ہوں گے۔"

باب سوم

کُوچۂ سیاست میں

پاکستان کا نام سامنے آتے ہی ہمارے ذہن میں دو نام اُبھرتے ہیں — محمد علی جناحؒ اور محمد اقبالؒ۔ اوّل الذکر نے اُس مقصدِ عظیم کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا جس کا خواب موخر الذکر نے دیکھا تھا۔ تاہم بہت سے لوگ برصغیر کی سیاست میں اُس کردار سے پوری طرح واقف نہیں ہیں جو حضرتِ علامہ نے ادا کیا اُن کا یہ خیال ہے کہ اہلِ قلم اور صاحبِ علم سیاست کی خارزار وادی میں قدم نہیں رکھتے۔ کُوچۂ سیاست میں بے شمار قباحتیں ہیں۔ ایک دوسرے پر کیچڑ اُچھالی جاتی ہے۔ لیکن بقول خود علامہ مرحوم "سیاست کو قوم سے وہی نسبت ہے جو جسم سے جان کو۔ سیاست آزادی ہے، اقدام ہے، سیاست کے معنی ہیں حیاتِ ملّی کا شعور۔ سیاست سے مدعا ہے اس نصب العین کی جدوجہد جس سے ہمارا مستقبل وابستہ ہے"۔

ہمیں اس حقیقت کو مدِ نظر رکھنا چاہیئے کہ دنیا کے کچھ عظیم شعراء ایسے بھی ہیں جنہوں نے پروردگارِ عالم کے عقائد کے گُن گائے۔ لیکن عظمت تو اس بات میں ہے کہ ان کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا جائے اس ضمن میں ملٹن اور دانتے کی مثالیں ممتاز ہیں۔

اس میں کوئی شُبہ نہیں کہ ۱۹۱۳ء سے ۱۹۲۳ء تک کے درمیانی عرصہ میں حضرت علاّمہ نے برّصغیر کی سیاست میں کوئی فعّال حصہ نہیں لیا۔ یہ وہ دَور تھا جب انہوں نے اپنی تمام تر توجہ مسلمانانِ ہند میں قومی شعور پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ اتفاق و اخوت کے جذبات پیدا کرنے میں صرف کردی۔ انہوں نے اپنی مشہور عالم نظمیں مثلاً اسرارِ خودی، رموزِ بے خودی۔ خضرِ راہ اور طلوعِ اسلام وغیرہ لکھیں۔ جب انہوں نے یہ محسوس کیا کہ وہ اپنے

مقصد کے حصول میں کامیاب ہو گئے ہیں تو وہ بلاخوف وخطر اس "آگ" میں کود پڑے۔ ان کی سیاسی معاملات میں دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ وہ انگلینڈ میں دوران حصولِ تعلیم سید امیر علی کی زیرِ صدارت منعقد ہونے والے مسلم لیگ کے اجلاسوں میں شرکت کیا کرتے تھے۔

جس زمانے میں حضرت علامہ اپنے فلسفہ کی نشو ونما میں مصروف تھے مسلم قائدین ہندو جارحانہ سیاسی ہوس کے ساتھ مفاہمت کی فکر میں تھے جسے قومیت کے کیپسول میں رکھ کر پیش کیا گیا۔ مفاہمت کی یہ کوششیں ۱۹۱۶ء کے میثاق لکھنؤ پر منتج ہوئیں۔ حضرت علامہ نے اس مفاہمت پر زبردست لے دے کی کیونکہ اس سے پنجاب اور بنگال میں مسلمان اکثریت اقلیت میں تبدیل ہو گئی تھی۔ اس کے علاوہ سر محمد شفیع بھی احتجاجاً مسلم لیگ سے مستعفی ہو گئے حالانکہ وہ قائداعظم محمد علی جناح کے شانہ بشانہ اس کی تیاری میں مصروف رہے تھے۔ اور میثاق دونوں کی کوششوں کا حاصل تھا۔

۱۳ اپریل ۱۹۱۹ء کو امرتسر میں ایک خونچکاں حادثہ پیش آیا جس کی مثال نہیں ملتی۔ جنرل مائیکل ڈائر نے ایک پُرامن ہجوم پر گولی چلانے کا حکم دیا جس کے نتیجہ میں ۴۰۰ افراد جاں بحق اور تقریباً ۱۵ سو زخمی ہوئے۔ شہداء کی یادگار تعمیر کرنے کے لئے چندہ جمع کرنے کی مہم کا آغاز کیا گیا۔ حضرت علامہ نے چندے میں درج ذیل قطعہ عنایت کیا ؎

ہر زائرِ چمن سے یہ کہتی ہے خاکِ باغ — غافل نہ رہ جہان میں گردوں کی چال سے
سینچا گیا ہے خونِ شہیداں سے اس کا تخم — تو آنسوؤں کا بخل نہ کر اس نہال سے

روایت ہے کہ کسی وطن دوست اور اقبال مرحوم کے کسی مداح نے یہ قطعہ کافی داموں میں جلیانوالہ باغ کی یادگار کمیٹی سے خرید لیا تھا۔

علامہ مرحوم تحریک خلافت کے زبردست حامی تھے۔ انہوں نے اس امر کی حمایت کی تھی کہ اسلامیہ کالج کا الحاق پنجاب یونیورسٹی سے توڑ لیا جائے اس مسئلہ میں ان کی رائے یہ تھی کہ علماء کی رائے کے مطابق فیصلہ کرنا چاہیئے یہ ۱۹۲۳ء کی بات ہے کہ حضرت علامہ کے کچھ رفقاء نے انہیں ترغیب دی

کہ وہ پنجاب لیجسلٹو کونسل کا انتخاب لڑیں۔ دوستوں کے ایماء پر وہ اس پر آمادہ ہو گئے لیکن اُن کے حامی یہ چاہتے تھے کہ وہ لاہور کے حلقہ سے انتخاب لڑیں۔ اس نشست سے میاں عبدالعزیز بھی ایک اُمیدوار تھے جن سے حضرت علامہ کے گہرے دوستانہ تعلقات تھے اس لئے انہوں نے انتخاب نہ لڑنے کا فیصلہ کیا اور تین سال کے بعد ۱۹۲۶ء میں خود کو بطور اُمیدوار پیش کیا۔

حضرت علامہ نے اپنے حامیوں کے ساتھ اپنی انتخابی مہم میں بھرپور حصّہ لیا۔ اپنی ایک انتخابی مہم میں انہوں نے نہایت ہی دل نشین تقریر کی۔ اس تقریب کا اہتمام ملک لال دین قیصر شیخ غلام مصطفےٰ حیرت شیخ محمد اشرف وغیرہ نے کیا تھا۔ لال دین قیصر ایک اَن پڑھ شاعر تھے اور ان کا خمیر محلہ ککے زئی سے اُٹھا تھا۔ مارشل لاء کے زمانے میں جن لوگوں نے ڈنڈا فوج تیار کی تھی لال دین قیصر اُس کے سرکردہ منتظمین میں سے تھے۔ اسی پاداش میں اُنہیں حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا ملی۔ حضرت علامہ کی انتخابی مہم میں ایسے زبردست محب الوطن اور غلام مصطفےٰ حیرت نے خوبصورت نظمیں تیار کیں۔ اس مہم میں لاہور کے زندہ دلان نے بھی اپنے محبوب شاعر مشرق کی حمایت میں دن رات ایک کر دیا لاہور کی ہر بارہ دری پر اُن کی حمایت میں پوسٹر آویزاں تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ملک محمد دین اور ان کے حامی بڑے بددل ہوئے۔ انتخابی جلسوں میں حضرت علامہ کے علاوہ سردوالفقار علی، مولانا عبدالمجید سالک، محمد بخش مسلم، راجہ عفنفر علی، لال دین قیصر اور غلام مصطفےٰ حیرت ہوتے تھے۔

ایک یادگار جلسہ کٹڑہ ولی شاہ میں ہوا۔ یہ علاقہ اس لحاظ سے کافی اہم تھا کہ یہاں حضرت علامہ کے حریف ملک محمد دین اور اُن کے کٹر حمایتی اور بااثر ککے زئی ملک خیر دین کے مکانات تھے۔ اس جلسے میں ملک لال دین قیصر نے اپنی مشہور نظم پڑھی، ہجوم جھوم گیا اور جلسے کے بعد کئی روز تک ہر چھوٹا بڑا اس کے اشعار گنگناتا پھرتا تھا۔ جس سے ملک محمد دین کے حامی بڑے زچ ہوتے ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

سر اقبال پیارے تائیں مندی دُنیا ساری اے
کی ہویا جے چنگڑ محلے بیٹھا اک انکاری اے

یہ اشارہ چنگڑ محلہ نزد پیسہ اخبار بازار کے محرم علی چشتی کی طرف تھا۔ ایک اور شعر ملاحظہ ہو ؎

جیبی پورہ اک پنڈ سُنیدا اور عقلوندا پٹواری اے
تھاں کرائے کوئی نہیں دہندا، بندہ اونج اعتباری اے

جیبی ایک رقاصہ تھی جس کا نام زیب النساء تھا۔ مولوی محرم علی چشتی کے اُس کے ساتھ آشنائی ہو گئی تھی۔ دو اشعار ملاحظہ ہوں ؎

کل اک یار نے اُوس نوں جا کے ایہہ اک بولی ماری اے
حضرت تہاڈی طاقت کتھے، اودھر دنیا ساری اے
کہن لگا اوہ بیوقوفا مت تیری گئی ماری اے
شہر لاہور اقبال والے سب ساڈا زور اتاری اے

حضرت علامہؒ کا انتخاب نومبر ۱۹۲۶ء میں ہوا اس وقت مسلم لیگ برائے نام ہی تھی۔ حضرت علامہ بھاری اکثریت سے کامیاب قرار پائے۔ ان کی وابستگی، چاہے عارضی طور پر ہی سہی، یونینسٹ پارٹی کے ساتھ تھی۔ لیکن اُن کی پارٹی کی قیادت کی حکمت عملی پر بھرپور تنقید سے پارٹی ناراض تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ لیجسلیٹو کونسل میں سیاسی ذرائع پر کنٹرول نہ ہونے کے باعث کونسل کے صدر (اسپیکر) منتخب نہ ہو سکے۔ حالانکہ سب کا عام طور پر یہ خیال تھا کہ وہ سب سے موزوں اُمیدوار ہیں۔

جناب عاشق حسین بٹالوی کا یہ خیال ہے کہ حضرت علامہ ۱۹۲۷ء تک سیاسیات میں عملی حصہ لینے سے ہمیشہ گریزاں رہے۔ یہاں تک کہ تحریک عدم تعاون کے زوال کے بعد جب آل انڈیا مسلم لیگ کی نشاۃ ثانیہ کا دور شروع ہوا اور اس دور کا پہلا اجلاس مئی ۱۹۲۴ء میں لاہور کے گلوب تھیٹر میں منعقد ہوا تو حضرت علامہ کے مکان واقع میکلوڈ روڈ اور گلوب تھیٹر کی دیواریں ساتھ ساتھ تھیں۔ لیکن اس قرب مکانی کے باوجود انہوں نے مسلم لیگ کے جلسے میں قدم رکھنا بھی گوارا نہ کیا دسمبر ۱۹۲۷ء میں جب مسلم لیگ دو حصوں میں بٹی تو حضرت علامہ جناح لیگ کے مخالف اور شفیع لیگ کے حامی تھے۔ یہاں تک کہ وہ شفیع لیگ کے

سیکرٹری بھی بن گئے تھے[1]۔

۱۹۲۷ء میں جب مرکزی اسمبلی کا اجلاس شروع ہوا تو پنڈت موتی لال — (سوراج پارٹی کے قائد) نے ایک روز دورانِ گفتگو میں مسٹر محمد علی جناح سے کہا کہ اختلافات کی اصل وجہ جُداگانہ نیابت پر مسلمانوں کا اصرار ہے۔ اگر مسلمان اس مطالبے سے دستبردار ہو جائیں تو میں ان کے باقی سب مطالبات کانگرس سے منوا سکتا ہوں[2]۔

مسٹر جناح نے اس تجویز کو پسند کیا۔ چنانچہ ان کی کوششوں سے ۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء کو دہلی میں مختلف الخیال مسلمان قائدین کی ایک مختصر کانفرنس اُن کی رہائش گاہ پر منعقد ہوئی۔ اس میں مولانا محمد علی، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، سر علی امام، راجہ صاحب محمود آباد، سر محمد شفیع، مفتی کفایت اللہ اور مولانا محمد شفیع داؤدی نے شرکت کی۔ پنجاب کی نمائندگی کے لئے سر فضل حسین کو مدعو کیا گیا لیکن انہوں نے صوبائی ایگزیکٹو کونسل کے رُکن ہونے کی وجہ سے معذرت کر دی۔

کئی نشستوں کے بعد ایک فارمولا تیار کیا گیا جسے تجاویز دہلی کا نام دیا گیا۔ کانگرس کے صدر سری نواس آئنگر بھی اس پر متفق تھے۔ یہ فارمولا ان نکات پر مشتمل تھا[3]:

۱۔ سندھ کو بمبئی سے علیٰحدہ کر دیا جائے۔

۲۔ صوبہ سرحد اور بلوچستان میں اصلاحات کا نفاذ کیا جائے اور انہیں دوسرے صوبوں کے برابر درجہ دیا جائے۔

۳۔ اس صورت میں مسلمان تمام صوبوں میں مخلوط حلقہ ہائے انتخاب کو قبول کرنے پر تیار ہوں گے۔

---

[1]: اقبال کے آخری دو سال ص ۳۱۳ — ۳۱۴ عاشق حسین بٹالوی۔ اقبال اکادمی کراچی (۱۹۶۹ء)

[2]: مارشل لاء سے مارشل لاء تک ص ۸۰

[3]: مارشل لاء سے مارشل لاء تک ص ۸۰-۸۱

Saiyid, M. H. Mohammad Ali Jinnah (Mohammad Ashraf, Lahore, 1953) pp. 238-39.

۴۔ سندھ، صوبہ سرحد اور بلوچستان میں مسلمان ہندو اقلیتوں کو وہی مراعات دینے پر تیار ہوں گے جو ہندو اپنی اکثریت کے صوبوں میں مسلم اقلیتوں کو دیں
۵۔ پنجاب اور بنگال میں تناسب آبادی کے لحاظ سے قائم کیا جائے۔
۶۔ مرکزی مقننہ میں مسلمانوں کے لئے ایک تہائی نشستیں مخصوص کی جائیں۔

مئی ۱۹۲۷ء میں آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے ایک قرارداد پاس کی جس میں "واقعی مسلم تجاویز کو قبول کر لیا گیا" [۱]

کانگرس نے فراخدلی کے ساتھ ان تجاویز کا خیر مقدم کیا اور ان پر غور کرنے کے لئے مجلس عاملہ کا اجلاس بلایا۔ دسمبر ۱۹۲۷ء میں لیگ اور کانگرس نے دہلی تجاویز کی بنیاد پر اپنے مذاکرات کو قطعی شکل دینے کے لئے ذیلی کمیٹیاں مقرر کیں تاکہ سوراج (حکومت خود اختیاری) آئین کا مسودہ مرتب کیا جا سکے [۲]

جب یہ تجاویز منظر عام پر آئیں تو نیم کانگرس، نیم مہاسبھائی پالیسی رکھنے والے ہندو اخبارات نے ان کے متعلق معاندانہ رویہ اختیار کیا۔ پنجاب مسلم لیگ نے سر فضل حسین میاں محمد شفیع اور حضرت علامہ کی سرکردگی میں دہلی تجاویز کی سخت مذمت کی۔ اس سے مسٹر جناح کی کانگرس کے ساتھ معاملہ کرنے کی حیثیت بُری طرح متاثر ہوئی [۳]۔

لیکن یہ تجاویز دو سال تک میدان میں رہیں اور دو سال تک مسلمان لیڈروں کے درمیان سیاسی خانہ جنگی رہی [۴] یکم مئی کو دہلی تجاویز کے خلاف لاہور میں ایک عام جلسہ ہوا جس کی صدارت سر محمد شفیع نے کی۔

حضرت علامہ نے ان تجاویز کے خلاف ایک قرارداد پاس کی۔ یہیں سے جلسوں

۱؎ Parshad, Rajandra; India Divided, (Bombay, 1947) p. 127.

۲؎ Zaman, Waheed uz., Towards Pakistan (Publishers United, Lahore, 1964) pp. 34-35.

۳؎ Ma ik, Hafeez; Iqbal, Poet-Philosopher of Pakistan (Columbia University Press, New York. 1971) p.88.

۴؎ : مارشل لاء سے مارشل لاء تک صفحہ ۱۸

اور مظاہروں کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا اور کلکتہ، پٹنہ، مدراس اور کئی دوسرے مقامات پر جلسے ہوئے۔

ان اختلافات نے اتنی شدت اختیار کرلی کہ لیگ کا وہ اجلاس جو لاہور میں منعقد ہونا قرار پایا تھا وہ نہ ہوسکا اور بیک وقت لیگ کا ایک اجلاس لاہور اور دوسرا اجلاس کلکتہ میں منعقد ہوا۔ لاہور والے اجلاس میں سر محمد شفیع کو لیگ کا صدر اور علامہ مرحوم کو سیکرٹری چن لیا گیا۔ کلکتہ والے اجلاس کی صدارت سر محمد یعقوب نے کی یہ دونوں اجلاس دسمبر ۱۹۲۷ء میں ہوئے۔

نومبر ۱۹۲۷ء میں وائسرائے ہند لارڈ ارون نے اعلان کیا تھا کہ آئینی اصلاحات کے نفاذ کے سلسلہ میں ایک شاہی کمیشن ہندوستان آئے گا۔ اس اعلان کے ساتھ ہی رائے عامہ تقسیم ہوگئی کہ اس کے ساتھ تعاون کرنا چاہیئے یا نہیں؟ مسلم لیگ بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ جناح لیگ نے کمیشن کا بائیکاٹ کیا، لیگ کی اس شاخ میں مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، ڈاکٹر مختار احمد انصاری مولانا ظفر علی خان اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو شامل تھے۔ لیگ کے دوسرے حصے کی قیادت سر محمد شفیع کر رہے تھے۔ شفیع لیگ کا یہ خیال تھا کہ کمیشن کے بائیکاٹ سے مسلمانوں کے مفادات کو نقصان پہنچے گا۔ ۱۵ دسمبر ۱۹۲۷ء کو علامہ اقبال، نواب ذوالفقار علی خان اور مولانا محمد علی (لاہوری جماعت کے قائد) نے ایک مشترکہ بیان جاری کیا جس میں اہل ہند سے عام طور پر اور مسلمانوں سے خاص طور پر اپیل کی گئی کہ وہ کمیشن کے ساتھ تعاون کریں[1]

سائمن کمیشن ۳ فروری ۱۹۲۸ء کو ہندوستان پہنچا۔ اسے یادداشت پیش کرنے کا مسودہ تیار کرنے کے لئے شفیع لیگ کی مسودہ تیار کرنے والی کمیٹی کا پہلا اجلاس مئی ۱۹۲۸ء کو ہوا۔ حضرت علامہ نے صوبائی خود مختاری پر بہت زور دیا۔ لیگ کے دیگر قائدین کی آراء کے استخراج کے لئے ایک تجرباتی مسودہ تیار کیا گیا، تاہم حضرت علامہ سر شفیع کے قدامت پسندانہ رویہ سے قدرے خائف تھے۔ کسی قطعی مسودے کی تیاری سے قبل وہ چند ہفتوں کے لئے بغرض علاج دہلی تشریف لے گئے۔ ان کی غیر حاضری میں

---

[1]:- پیسہ اخبار ۱۰ دسمبر ۱۹۲۷ء، انقلاب ۱۱ نومبر ۱۹۲۷ء

قطعی مسودہ پریس میں آگیا۔ حضرت علامہ کو یہ دیکھ کر سخت مایوسی ہوئی۔ انہوں نے اسے موجودہ آئینی مسائل کے حل کے لئے رجعت پسندانہ خیال کرتے ہوئے لیگ کے سیکرٹری کے عہدے سے استعفےٰ دیدیا۔ انہوں نے ۲۴ جون ۱۹۲۸ء کو اپنا استعفےٰ اشاعت کی غرض سے پریس کو بھیجا، انہوں نے لکھا تھا "اب مجھے معلوم ہوا ہے کہ پریس میں شائع شدہ لیگ کی یادداشت کے اقتباس میں مکمل صوبائی خودمختاری کا کوئی مطالبہ نہیں کیا گیا۔ یہ ایک صوبائی وحدانی طرزِ حکومت کی تجویز پیش کرتا ہے جس میں قانون، نظم اور انصاف براہِ راست گورنر کی تحویل میں ہونے چاہئیں ...

یہ تجویز دوعملی کی محض ایک چھپی ہوئی شکل ہے اور آئینی پیش قدمی ہرگز نہیں کرتی ...... ان حالات میں، میں آل انڈیا مسلم لیگ کا سیکرٹری نہیں رہنا چاہتا۔[۱]

اب سر محمد شفیع نے فوراً ہی پانسا پلٹا اور حضرت علامہ کی تجاویز کو منظور کر لیا۔ جنہوں نے اپنا استعفےٰ واپس لے لیا اور یادداشت کے قطعی مسوّدے پر اپنے دستخط ثبت کر دئے۔ ۵ نومبر ۱۹۲۸ء کو جب لیگ کا وفد شہادت کے لئے سائمن کمیشن کے سامنے پیش ہوا، حضرت علامہ نے سر محمد شفیع کو کمیشن کے سوالات کے جوابات دینے میں مدد دی۔

دریں اثنا میں لیجسلیٹو کونسل کی کارروائیوں میں فعّال دلچسپی لینا جاری رکھی ۱۹۲۷ء میں انہوں نے نہرو کمیٹی کے روبرو پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبہ اور سندھ کے ادغام کی تجویز پیش کی، جو قابلِ اعتنا نہ سمجھی گئی کیونکہ :-

" اسی قسم کی لیکن اس سے کچھ وسیع تجویز ہمارے سامنے پہلے بھی پیش کی جاچکی ہے کہ پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبہ، بلوچستان اور سندھ کو مدغم کردینا چاہیئے۔ اور یہ کہ نشستوں کو اس وقت تک مخصوص نہ کیا جائے، جب تک اس علاقہ کا اقلیتی فرقہ خواہاں نہ ہو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم ایک ایسا صوبہ پیدا کردیں جو سارے شمال مغرب کو اپنی لپیٹ میں لے لے"۔

جب نہرو رپورٹ شائع ہوئی تو مسلمانوں کی آنکھیں کھلیں اور انہوں نے اس

---

[۱] Shamloo, pp.163-164

کے خلاف صدائے احتجاج و مذمت بلند کردی۔ یہ رپورٹ مسلمانوں کے لئے ایک سیاسی موت تھی اور مسلمانوں کو انگریزوں کے فوجی اختیارات کے تحت نہدو بنانے کی ایک گہری سازش تھی۔

مسلم قیادت نے جلد ہی سیاسی اتحاد کی ضرورت کو محسوس کیا تاکہ موثر طور پر برطانوی ارباب اقتدار اور کانگرس کے ساتھ معاملہ کیا جاسکے۔ اس مقصد کے لئے آل پارٹیز مسلم کانفرنس (جسے بعد میں آل انڈیا مسلم کانفرنس کا نام دیا گیا) کا انعقاد عمل میں آیا۔ یہ کانفرنس ۳۱ر دسمبر ۱۹۲۸ء اور یکم جنوری ۱۹۲۹ء کو دہلی میں سر آغا خان کی صدارت میں ہوئی حضرت علامہؒ اس کانفرنس کے بڑے سرگرم رکن تھے اور انہوں نے سر فضل حسین کے ساتھ مل کر اس کانفرنس کے خیال کی تحریک پیش کی تھی۔ پہلے وہ اس کی مجلس عاملہ کے رکن بنے اور پھر اس کے صدر بن گئے تھے۔ جناح۔ کچلو اور شفیع۔ اقبال لیگ کے وہ گروہ تھے جنہوں نے دیگر مسلم قائدین کے ساتھ اس کانفرنس میں شرکت کی تھی۔ کانفرنس میں ایک قرارداد کے ذریعے برطانوی حکومت کو نہرو رپورٹ کی حقیقت سے آگاہ کیا گیا اور صاف صاف بتا دیا کہ مسلمانوں کی تمام جماعتیں کسی ایسے دستور کو منصفانہ اور غیر جانبدارانہ تصور نہیں کریں گی جس کی بنیاد نہرو رپورٹ پر ہوگی۔ کانفرنس نے مسلم دعووں کا منشور منظور کیا۔ "جن میں سب سے اہم یہ تھا کہ مستقبل کا آئین وفاقی ہوگا۔ جس میں زیادہ سے زیادہ خود مختاری کے ساتھ بقیہ اختیارات صوبوں کے پاس ہوں۔ جداگانہ انتخابات کی وقعت ترک نہ کی جائے اور مرکزی اور صوبائی وزارتوں میں اُن کا جائز حصہ ہونا چاہیئے۔"[1]

ڈاکٹر سیف الدین کچلو کا کہنا ہے کہ:۔

"جب دسمبر ۱۹۲۸ء میں کلکتہ کی آل انڈیا کنونشن نے اُن تینوں ترمیموں کو بے دردی سے رد کر دیا۔ جو مسٹر جناح نے پیش کی تھیں، تو مسلم لیگ کی حالت سخت نازک ہوگئی۔ مسلمانوں کا سوادِ اعظم مسلم کانفرنس کی قیادت میں آچکا تھا۔ ادھر کانگرس نے

Coupland, Sir Reginald; India: A Restatement (Oxford University Press, London. 1945) p.130.

یوں ہمارا دستِ تعاون جھٹک دیا۔ ان حالات میں میں ڈاکٹر اقبال کی خدمت میں لاہور حاضر ہوا تاکہ مفاہمت کی کوئی صورت پیدا کی جائے۔ ڈاکٹر صاحب نے مسٹر جناح کے رویّے پر سخت نکتہ چینی کی اور فرمایا کہ مسلمانوں کی سیاست میں مسٹر جناح نے جو اُلجھنیں پیدا کر دی ہے۔ جب تک وہ اُس پر ندامت کا اظہار کر کے آئندہ اس سے کلیتہً مجتنب رہنے کا وعدہ نہ کریں گے۔ مصالحت نہیں ہو سکتی"[1]

منٹو مارلے اصلاحات (۱۹۰۹ء) نے اگرچہ مسلمانوں کو جُداگانہ حق انتخاب دیدیا لیکن یہ عوامی توقعات پہ پوری نہ اُترتی تھیں۔ پنجاب کے ساتھ امتیازی سلوک کیا گیا آسام کی طرح اس کی لیجسلیٹو کونسل محض ۳۰ اراکین پر تشکیل دی گئی۔ پنجاب کی آبادی ۲۰ ملین تھی۔ جبکہ آسام کی آبادی محض ۷ ملین تھی۔ علاوہ ازیں ۱۹۲۰ء تک پنجاب کا لیفٹیننٹ گورنر کسی انتظامی کونسل کے بغیر ہی اپنے فرائض کی بجا آوری کرتا تھا ۱۹۱۹ء میں مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات کا نفاذ عمل میں آیا ان کی رُو سے دو عملی کا رسوائے زمانہ نظام رائج کیا گیا اور گورنر کو لاتعداد امتیازی اختیارات تفویض کئے گئے۔ حضرت علامہ ان اصلاحات سے قطعًا ناخوش تھے۔ یہی وجہ ہے کہ کونسل کی رُکنیت کے دوران میں وہ حکومت کی مختلف پالیسیوں پر تنقید کرتے رہتے تھے۔ زمینی نظام پہ ان کی تنقید اتنی زبردست تھی کہ حکومت کے کان کھڑے ہو گئے۔ یہ نظریہ کہ زمینیں کراؤن کی ملکیت ہے۔ حضرت علامہ کے نزدیک ایک وحشیانہ نظریہ تھا۔ انہوں نے فرمایا کہ نہ تو قدیم ہندوستان میں اور نہ ہی مغلوں کے دور میں فرمانرواؤں نے کبھی عالمگیر ملکیت کا دعویٰ کیا۔ بانیٔ مغلیہ سلطنت، ظہیر الدین بابر کے یہاں آنے سے بہت پہلے بھی اہل پنجاب زمینوں کے مالک ہوا کرتے تھے۔ صریحی سبق یہ ہے کہ کراؤن آتے اور جاتے ہیں۔ صرف عوام ہی لافانی ہیں"[2]

۲۳ فروری ۱۹۲۸ء کو حضرت علامہ نے لیجسلیٹو کونسل میں زمینی لگان کے موضوع

---

[1] :۔ اقبال کے آخری دو سال صـ ۳۱۴ عاشق حسین بٹالوی

[2] :۔ پنجاب لیجسلیٹو کونسل میں حضرت علامہ کی تقریر مورخہ ۵ مارچ ۱۹۲۷ء بحوالہ Shamloo, p.63.

پر ایک دلچسپ تقریر کی ۔ انہوں نے فرمایا :-

"میں شملہ کے معزز نمائندہ کو بتانا چاہتا ہوں کہ اس نظریہ (زمین کا ریاستی ملکیت کا نظریہ) کو باطل قرار دینے والا پہلا یورپی مصنف فرانسیسی پیرون تھا جس نے ۱۷۷۷ء میں اسے جھٹلایا ۔ بعد میں ۱۸۳۰ء میں برگس نے ہندوستان میں زمین کی ریاستی ملکیت کے نظریئے کے متعلق قانون اور اس پر عمل کے موضوع پر وسیع تحقیق کی ۔ اس نے اپنی کتاب میں ہندوستان کے مختلف حصوں ۔۔ بنگال ، مالوہ ، پنجاب وغیرہ میں قوانین منوں ، اسلامی قانون اور مروّجہ دستور کا نہایت محتاط تذکرہ کیا ۔ وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ ہندوستان میں کسی دور میں بھی ریاست نے زمین کی ملکیت کا کبھی دعویٰ نہیں کیا ۔"

حضرت علامہ کا یہ خیال تھا کہ نظامِ لگان نا انصافی پر مبنی تھا اس کے علاوہ یہ چھوٹے زمینداروں اور غیر حاضر زمینداروں میں کوئی امتیاز نہیں کرتا تھا انہوں نے یہ تجویز پیش کی کہ لگان شرح آمدن کے لحاظ سے انکم ٹیکس ہونا چاہیئے ۔ یونینسٹ حکمران اُس شخص پر تو لگان نہیں لگاتے جو زمین کے علاوہ کسی دوسرے ذریعہ سے دو ہزار روپیہ کماتا تھا ۔ جبکہ وہ کسان پر مالیہ عائد کرتے ہیں چاہے وہ اس سے کم ہی کمائے ۔ پنجاب میں معاشی اعتبار سے پنپنے والا زمینی قطعہ آٹھ ایکڑ تصور کیا گیا ۔ حضرت علامہ کا مُوقف یہ تھا کہ پانچ بیگھے زمین تک مالیہ معاف کر دینا چاہیئے ۔ اس کے برعکس یونینسٹ سربراہ سر فضل حسین کا مؤقف اس سے یکسر مختلف تھا کہ کم سے کم معاشی زمینی ملکیت دس یا گیارہ بیگھے تھی اور پانچ بیگھے پر معافی سے کسان کو تو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا ۔ لیکن بجٹ میں ۲ کروڑ ۵۵ لاکھ روپے کا خسارہ پیدا ہو گا ۔ سر فضل حسین کے نزدیک یہ بے ثمر گناہ تھا ۔ حضرت علامہ کا موقف یہ تھا کہ ہو سکتا ہے کہ بے ثمر گناہ ہی ہو لیکن اس سے یہ ظاہر ہو گا کہ "آپ میں کم از کم انصاف کا کچھ تصور تو ہے[1]

۴ مارچ ۱۹۲۹ء اور ۷ مارچ ۱۹۳۰ء کو حضرت علامہ نے بجٹ میں توازن پیدا کرنے کے لئے کچھ تجاویز پیش کیں انہوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ "ہم دنیا کے کسی بھی دوسرے ملک کی نسبت نظم و ضبط کے موجودہ نظام پر زیادہ خرچ کرتے ہیں" لیجسلٹو کونسل میں موجود برطانوی افسران نے اس پر فی الفور احتجاج کیا اور اس طرح حضرتِ علامہ کی یہ تجویز کہ افسر شاہی کے اہل کاروں کے مشاہروں میں کٹوتی کی جائے، منظور نہ ہو سکی۔ پھر انہوں نے ٹیکس میراث عائد کرنے کی تجویز پیش کی کہ بیس یا تیس ہزار روپے کی جائیداد ترکے میں حاصل کرنے والوں پر لگایا جائے حضرتِ اقبال نے اسے "ٹیکس اموات" کا نام دیا۔ سر فضل حسین نے فوراً ہی کہا کہ "زندہ رہنے والوں پر ٹیکس زیادہ مناسب رہے گا" لیکن حضرت اقبال نے ترکی بہ ترکی جواب دیا کہ "اس ٹیکس کی ادائیگی تو زندہ رہنے والے ہی کریں گے"[1]

کونسل میں زیادہ تر زمیندار تھے یا ان کے حامی اس لئے یہ تجاویز منظور نہ ہو سکیں۔ اس پسِ منظر میں حضرتِ اقبال نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ زمین ذریعہ پیدائش کی حیثیت سے افراد کی ملکیت نہیں ہونی چاہیئے ؎

دِہ خدایا! یہ زمین تیری نہیں، تیری نہیں
تیرے آبا کی نہیں، تیری نہیں، میری نہیں

حضرت علامہ نے پنجاب کے دیہاتوں میں طبی سہولتوں کے فقدان اور نیلی بار کے کاشتکاروں کی مشکلات کی طرف ارباب اختیار کی توجہ مبذول فرمائی۔ اپریل ۱۹۳۵ء میں سر فضل حسین وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل سے سبکدوش ہو کر لاہور آ گئے انہوں نے ہمیشہ ہی قومی تحریکوں کو کچلا اور مسلمانوں کے مسائل کو صرف اور صرف اپنی بصیرت کے مطابق حل کرنے کی کوشش کی۔ انہی دنوں حضرت علامہ نے انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔

"یہ کس قدر افسوسناک امر ہے کہ پنجاب میں شہری دیہاتی کا جو جھگڑا چل رہا ہے اسے سر فضل حسین کی امداد حاصل ہے۔ فضل حسین کو ابتداء میں قیادت کا منصب اس لئے حاصل نہیں ہوا تھا کہ وہ دیہاتی تھے۔ بلکہ اس لئے کہ وہ صوبے کے

---

[1] Ibid; p.85.

مسلمانوں کے لیڈر تھے۔ لیکن انہوں نے قیادت حاصل کرنے کے بعد جان بوجھ کر شہری دیہاتی جھگڑے کو تیز کرنا شروع کر دیا تاکہ اس طرح اُن کا منصب بحال رہے۔ اس جھگڑے سے فائدہ اٹھا کر اُنہوں نے بعض ایسے ناکارہ اور تیسرے درجے کے آدمیوں کو اپنا رفیق منتخب کیا جو حکومت کے قطعاً اہل نہ تھے۔ اور جن میں اتنی صلاحیت بھی نہ تھی کہ اُس اقتدار اور وقار کو برقرار رکھ سکیں جو وزارت کا لازمہ ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تیسرے درجے کے لوگ جو اپنے موجودہ عروج کے لئے فضل حسین کے ممنون ہیں۔ خود ادنیٰ صلاحیت کے مالک ہونے کے باعث فضل حسین کو گویا ایک مافوق البشر سمجھنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ حکومت کے بعض کارندوں نے بھی اس پالیسی کی حمایت کی۔ کیونکہ اس طرح وہ ۱۹۱۹ء کی اصلاحات کا زور توڑنے میں کامیاب ہو سکتے تھے۔ ان تمام اسباب و محرکات کا نتیجہ یہ نکلا کہ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان میں صحیح "لیڈرشپ" مفقود ہو چکی ہے اور سیاسی میدان چند حد درجہ نالائق مقدر آزماؤں کے قبضے میں چلا گیا ہے"[1]

حضرت علامہ، سر فضل حسین کے ہم جماعت رہ چکے تھے اور اُن کے ذہنی فکری اُفق سے بخوبی واقف تھے اور یونینسٹ پارٹی کے ساتھ وابستگی کی وجہ سے جانتے تھے کہ شہری دیہی چپقلش کس کے ذہن کی پیداوار ہے۔ ۱۹۳۴ء میں پنجاب کے گورنر سر ہربرٹ ایمرسن نے انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس میں سپاسنامے کے جواب میں کہا تھا کہ مسلمان باہمی نفاق کو چھوڑ کر کسی بلند پایہ قائد کی رہنمائی حاصل کریں۔ علامہ مرحوم نے گورنر کے اس مشورے کے جواب میں ایک بیان جاری کیا گیا جس میں کہا گیا کہ:-

"میں گورنر کا ممنون ہوں کہ انہوں نے مسلمانانِ پنجاب کو اتحاد و نفاق کی تلقین کی ہے۔ لیکن کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ خود حکومت بھی اپنے اعمال و افعال کا محاسبہ کرے؟ میں پوچھتا ہوں کہ اس وقت پنجاب کے مسلمانوں میں شہری اور

---

[1]:- اقبال کے آخری دو سال ص ۲۷۶ - ۲۷۷ - عاشق حسین بٹالوی

دیہاتی کی جو خوفناک تفریق قائم ہو چکی ہے اور جس نے اس صُوبے کے مسلمانوں کو دو متحارب گروہوں میں تقسیم کر دیا ہے وہ کس کی قائم کی ہوئی ہے؟ یہ تفریق صرف شہری اور دیہاتی مسلمانوں تک محدود نہیں رہی بلکہ اس نے خود دیہاتی مسلمانوں کو بھی قسم قسم کی ٹولیوں میں تقسیم کر دیا ہے جو آئے دن ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار رہتی ہیں۔

"سر ہربرٹ ایمرسن نے اس بات پر افسوس ظاہر کیا ہے کہ پنجاب کے مسلمان کوئی بلند پایہ لیڈر پیدا نہیں کر سکے۔ کاش سر ہربرٹ ایمرسن کو امر کا احساس ہوتا کہ پنجاب کے شہری اور دیہاتی مسلمانوں میں جو خوفناک پھوٹ پڑ چکی ہے وہ سراسر حکومت نے خود پیدا کی ہے اور حکومت ہی اس پھوٹ کو قائم رکھنے پر مُصر ہے ہماری قومی سیاست ایسے خود غرض اور طالع آزما قسم کے افراد کے ہاتھوں میں چلی گئی ہے جن کے سامنے صرف جلبِ منفعت کے ذاتی اغراض ہیں اور جو مسلمانانِ پنجاب میں یک جہتی قائم کرنے کے ہرگز خواہاں نہیں۔ حکومت خود ان غرض مند افراد کی سرپرستی کرنے میں مصروف ہے اور یوں بالواسطہ شہری دیہاتی جھگڑے کو زور شور سے ہوا دے رہی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ مسلمان کوئی بلند پایہ لیڈر پیدا کرنے کی صلاحیت ہی سے محروم ہو چکے ہیں۔ اس صورتِ حال کو دیکھ کر میں تو یہ سمجھنے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ حکومت نے یہ طرزِ عمل غالباً اختیار ہی اس واسطے کیا تھا کہ پنجاب میں کوئی حقیقی لیڈر پیدا نہ ہو سکے۔

"سر ہربرٹ ایمرسن نے تو مسلمانوں میں حقیقی لیڈر شپ کے فقدان پر اظہارِ افسوس کیا ہے۔ میں اس کے برعکس اس بات پر افسوس کا اظہار کرتا ہوں کہ حکومت نے جان بوجھ کر ایسا طرزِ عمل اور پالیسی اختیار کر رکھی ہے جس نے اس صُوبے میں اصلی اور پائیدار لیڈر شپ کے پیدا ہونے کی تمام اُمیدوں کا قلع قمع کر دیا ہے"[1]

سائمن کمیشن نے مئی ۱۹۳۰ء میں اپنی رپورٹ حکومتِ برطانیہ کو پیش کی۔ یہ رپورٹ دو حصوں پر مشتمل تھی۔ اول حصہ میں برصغیر کے مسائل پر سیر حاصل بحث کی گئی تھی اور دوسرے حصے میں کمیشن کی سفارشات اور تجاویز پیش کی گئیں۔ مسلمانوں کے لئے یہ رپورٹ

---

[1]:- الفضل ص ۲۷۸ - ۲۷۹

ناقابلِ قبول تھی - کیونکہ اُن کے حکومتِ خود اختیاری کے مطالبے کو مُسلم کئے جانے کا کہیں ذکر نہ تھا - ۲۴ جون ۱۹۳۰ء کو حضرت علامہ نے سائمن کمیشن کی رپورٹ پر یوں تبصرہ کیا -

"ہندوستانی خواہشات کی تکمیل کے لئے کم سے کم جو بات کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ صوبائی خود اختیاری عطا کر دی گئی ہے تو وہ بھی واضح اور نمایاں نہیں - ہمارے اپنے صوبہ میں اور بنگال میں مسلمانوں سے اُصول جمہوری کے حقوق بھی چھین لئے گئے ہیں لیکن آٹھ صوبوں میں سے چھ صوبوں کے اندر ہندو اکثریت اپنی حکومتیں آپ مرتب کرنے کے حق سے مستفیض ہو گی - اور مسلمان ان دو صوبوں میں بھی جہاں ان کی اکثریت ہے پنجاب میں مساویانہ درجہ اور بنگال میں اقلیت میں تبدیل کر دیئے گئے ہیں - ہندوستان میں طاقت کا ایک خفیف توازن قائم رکھنے کے متعلق مسلمانوں کی اُمیدیں قطعی طور پر خاک میں ملا دی گئی ہیں وہ صرف ان چھ صوبوں میں گھاٹے میں نہ رہیں گے جہاں ان کی اقلیت ہے بلکہ اس بات کا شدید احتمال ہے کہ ان دو صوبوں میں جہاں وہ اکثریت میں ہیں ان پر اقلیتوں کا ظلم ہوتا رہے گا -

حیرت ہے کہ سر جان سائمن اور ان کے رفقاء نے یہ کہہ کر کہ پنجاب اور بنگال میں فرقہ وارانہ حکومت قائم ہو جائے گی - عجیب نامطابقت کا اظہار کیا ہے لیکن یہ دیکھ کر اور زیادہ تعجب ہوتا ہے کہ کمیشن نے نہایت آسانی سے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا ہے کہ اس قسم کی فرقہ وارانہ حکومت باقی چھ ہندو صوبوں میں بھی تو قائم ہو جائے گی پس یہ واضح ہے کہ کمیشن مسلمانوں کے معاملے میں اس بات کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں جس کی ہندوؤں کے معاملہ میں پورے طور پر حمایت کی گئی ہے -

اگر شاہی کمیشن نے اپنی سفارشات کی بنا میثاق لکھنؤ کو یا ان چند ایک مسلمانوں کی تجاویز کو قرار دیا ہے جو آبادی کے تناسب کے لحاظ سے نمائندگی کا مطالبہ کر چکے ہیں تو کمیشن کو سمجھ لینا چاہیئے کہ مسلمانانِ

ہندوستان نے مقدم الذکر کو کبھی قبول نہیں کیا اور موخر الذکر کی اسلامی اخبارات اور عوام نے شدید مذمت کی تھی۔"

مئی ۱۹۲۹ء میں برطانیہ میں نئے انتخابات کے بعد ریمزے میکڈونلڈ نے لیبر وزارت کی تشکیل کی۔ سائمن کمیشن کے قیام کے دوران میں ہندوستان میں وسیع پیمانے پر ایجی ٹیشن ہوئے تھے۔ علاوہ ازیں لوگوں کو اس کے طریق عمل پر بھی اعتراض تھا۔ اکتوبر ۱۹۲۹ء میں وائسرائے لارڈ اِروِن نے لندن میں گول میز کانفرنس کے انعقاد کا اعلان کیا جس میں برصغیر میں مستقبل کی آئینی اصلاحات کے مسئلے پر غور کرنے کا وعدہ کیا گیا۔ گول میز کانفرنس کا پہلا دور ۱۲ نومبر ۱۹۳۰ء سے ۱۹ جنوری ۱۹۳۱ء تک لندن میں ہوا۔ اس میں حضرت علامہ نے شرکت نہیں کی تھی کہ انہیں مدعو نہیں کیا گیا تھا۔ اسی کانفرنس کے عرصہ کے دوران میں حضرت علامہ نے الہ آباد میں اپنا مشہور خطبہ دیا تھا۔ جب کانفرنس کا دوسرا دور (۷ ستمبر سے یکم دسمبر ۱۹۳۱ء) شروع ہوا تو حضرت علامہ بھی مدعوین سے ایک تھے۔[1]

مسٹر گاندھی نے کانگرس کی نمائندگی کی تھی۔ انہوں نے مسلم مندوبین (سر آغا خان، محمد علی جناح، سر محمد شفیع، مولانا شوکت علی اور سر علی امام) کی حیثیت کو شک کی نگاہ سے دیکھا۔ مذاکرات کے دوران میں سر آغا خان نے اس نکتے کی طرف اشارہ کیا کہ "استدلال ہمیشہ ہی اختلاف کے بعض بنیادی نکات پر آجاتا کہ کیا ہندوستان ایک قوم ہے یا دو؟"[2]

مسلم مندوبین کا موقف یہ تھا کہ برطانوی راج نے ہندوستان میں مصنوعی اور عارضی علاقائی وحدت پیدا کر رکھی تھی جب کہ مختلف گروہوں کے درمیان گہرے

---

[1] ۱۔ جناب عاشق حسین بٹالوی کا یہ خیال ہے کہ حضرت علامہ کو سر فضل حسین نے دوسری گول میز کانفرنس میں مندوب بنا کر انگلستان بھیجا تھا۔ ملاحظہ کریں اقبال کے آخری دو سال ص ۲۸۰

[2] Khan, Agha; The Memoirs of Agha Khan (London, Cassell, 1954) p.228

مستحکم، ثقافتی اور نسلی اختلافات موجود تھے۔ مسٹر گاندھی سختی سے ایک قومی نظریہ پہ کاربند رہے تاہم اگر شرکاء تفصیل کے نکات پر سمجھوتہ کر سکتے تو اُصول پہ یہ قطعی ناموافقت کی خلیج پُر کی جا سکتی تھی۔"[1]

کانفرنس میں دو کمیٹیاں یعنی وفاقی اُمور کی کمیٹی اور اقلیتوں کے اُمور کی کمیٹی تشکیل کی گئیں۔ لیکن اراکین فرقہ وارانہ مسئلے کا کوئی متفقہ حل تلاش نہ کر سکے۔ کانفرنس میں حضرت علامہ نے اقلیتوں کے متعلق ذیلی کمیٹی میں اپنا کردار ادا کیا۔ بعد میں انہوں نے انکشاف کیا کہ مسٹر گاندھی نے یہ شرط بھی عائد کی تھی کہ مسلمان دوسری اقلیتوں اور خصوصاً اچھوتوں کی نمائندگی سے دستبردار ہو جائیں۔ حضرت علامہ نے فرمایا "مسلمان اُچھوتوں کے بارے میں قطعاً ایسی بات نہیں کریں گے جو اُچھوت خود نہ کہتے ہوں۔ البتہ اُن کے مطالبات پیش کرنے میں مسلمان نمائندوں کو روکا نہیں جا سکتا۔ اگر گاندھی اُچھوتوں سے کانفرنس سے باہر کوئی سمجھوتہ کر لیں تو مسلمان اس مسئلہ کو زیر بحث نہ لائیں گے۔" اب مسٹر گاندھی نے یہ قلابازی کھائی اور کہا کہ "اگر ہندوستان کے سارے مسلمان (بشمول نیشنلسٹ مسلمان) کوئی متفقہ فیصلہ دیں تو وہ خالی چیک پر دستخط کرنے کے لئے تیار ہیں۔"

حضرت علامہ نے مسٹر گاندھی سے استفسار کیا کہ "اگر کوئی تصفیہ ہو جائے تو کیا اس تصفیہ کو مسٹر گاندھی پوری کانگرس کی جانب سے منظور کرا سکیں گے؟"۔ اس پر گاندھی نے جواب دیا۔ "میں نے ابھی تک کانگرس کی رُکنیت بھی اختیار نہیں کی، میں کس طرح معاہدہ یا تصفیہ کو منظور کرا سکتا ہوں۔"

مشہور مورّخ کوپ لینڈ رقمطراز ہے:۔ "مسٹر گاندھی یا تو ہندو مسلم سمجھوتہ کے لئے مثبت اور تعمیری تجاویز پیش کر ہی نہیں سکتے یا پھر جان بوجھ کر منفی رویہ اپنائے ہوئے تھے۔"[2]

مسٹر گاندھی کے ساتھ کسی بھی قسم کی مفاہمت میں ناکامی کی وجہ سے سکھوں کے سوا

---

[1]:۔ ایضاً ص ۲۲۹

[2]:۔ ملاحظہ کریں اُس کی تصنیف: Indian Politics (1936-1942)

آقلیتوں نے انڈین آقلیتوں کے میثاق پر دستخط کئے اور اسے برطانوی وزیراعظم کے حوالے کر دیا۔ اس کام کے مکمل ہوتے ہی آقلیتوں کے متعلق کمیٹی کا آخری اجلاس ۱۳ر نومبر کو ختم ہوگیا۔

خود مسلم وفد کے اندر حضرت علامہ کا مؤقف یہ تھا کہ برطانوی حکومت کو مشورہ دیا جائے کہ وہ حکومت ہند میں مرکزی ذمہ داری کے اصول کو رواج دینے سے قبل صوبائی خود مختاری کو قبول کر لے۔ اُن کی رائے یہ تھی کہ ہندوستان میں جدید وفاقی دستور کے موثر نتائج حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ صوبائی سطح پر کافی کام کیا جائے۔ وفد کے باقی شرکاء کا بھی یہی خیال تھا۔ اسی لئے ۱۵ر نومبر کو انہوں نے وفاقی ڈھانچے کی کمیٹی کے مذاکرات میں شرکت نہ کرنے کا فیصلہ کیا اپنے ابتدائی فیصلے کو نظر انداز کرتے ہوئے مسلم مندوبین وفاقی کمیٹی میں ۲۶ر نومبر کو بیک وقت صوبائی خود مختاری اور مرکزی ذمہ داری کے نفاذ پر متفق ہو گئے۔

حضرت علامہ کو شک تھا کہ مسلم "ترجمان برطانوی ہند کے صوبوں میں ذمہ دار حکومت کے فوری نفاذ کو مسترد کرنے میں بعض انگریز سیاستدانوں کے مشورے کے فریب میں تھے۔" مسلم مندوبین کی اس حکمت عملی کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے (کیونکہ یہ صوبائی خود مختاری کے لئے جدوجہد کی راہ میں مزاحم ہوگی) حضرت علامہ نے خود کو وفد سے الگ تھلگ کر لیا۔ جہاں تک اُن کے تقسیم ہند سے متعلق خیالات تھے تو اپنے قیام لندن کے دوران بھی اُنہوں نے اپنے خیالات کی اشاعت و تبلیغ جاری رکھی۔ فرنیک مورس (انڈین ایکسپریس کا ایڈیٹر) جنہیں ہندوستانی اُمور پر ہمیشہ سند تسلیم کیا گیا ہے نے اپنی کتاب "دور — ایک دنیا" میں لکھا ہے کہ میں نے شیفیلڈ انڈین ریسٹورنٹ واقع گیرڈ اسٹریٹ (جو اُن دنوں ہندوستانیوں کا پسندیدہ مرکز تھا) میں اقبال کو دوسری میز پر کھانا کھاتے دیکھا۔ اس دوران میں وہ ہندوستان کی تقسیم کے متعلق گفتگو کرتے رہے۔

کانفرنس کے مسلمان مندوبین میں سے سب سے زیادہ کامیاب سر آغا خان اور چوہدری ظفر اللہ ثابت ہوئے۔ مسلمان وفد کی رہنمائی سر فضل حسین کی کوششوں سے سر آغا خان کے سپرد ہوئی۔ حضرت علامہ اس ماحول میں زیادہ دیر تک نہ ٹھہر سکے

ر کانفرنس کے اختتام سے پہلے ہی یعنی ۲۰ر دسمبر کو واپس وطن آ گئے۔ اس کی وجہ جناب عاشق حسین لوی کی زبانی سنیئے :-

" اس قسم کی کانفرنس میں سازش، ریشہ دوانی، خوشامد اور منافقت کا دَور دورہ ہوتا ے، وہاں بلاوجہ ہنس ہنس کر باتیں کرنے اور بوقت ضرورت جھوٹ بول دینے سے) دریغ نہیں کیا جاتا" اور جس شخص کی ساری عمر اس طرح بسر ہوئی ہو کہ ؎

اسی کشمکش میں گذریں مری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و سازِ رومی، کبھی پیچ و تابِ رازی

ر جس شخص کا اپنے متعلق یہ دعویٰ ہو کہ ؎

سکھلائی فرشتوں کو آدم کی تڑپ اس نے
آدم کو سکھاتا ہے آدابِ خداوندی[۵]

یہ وہ وقت تھا کہ محمد علی جناح نے برصغیر کی سیاست سے بددل ہو کر لندن میں مستقل لونت اختیار کر لی تھی۔ حضرت علامہ اور محمد علی جناح کے درمیان ملاقاتیں ہوتی رہیں اور رنوں اس بات پر متفق ہو گئے کہ گول میز کانفرنس محض ایک ڈھونگ ہے۔

کانفرنس کے آخری روز برطانوی وزیر اعظم نے تمام شرکاء سے اپیل کی کہ وہ فرقہ رانہ مسائل کا حل تلاش کریں۔ اور اگر اس میں ناکامی رہی تو حکومت خود کوئی عارضی فیصلہ رنے پر مجبور ہو جائے گی چنانچہ ایسا ہی ہوا اور ۱۶ر اگست ۱۹۳۲ء کو حکومت برطانیہ نے اپنا فیصلہ سُنا دیا۔ یہ فیصلہ کیمونل ایوارڈ یا فرقہ وارانہ فیصلہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس کی رُو سے مسلمانوں کے لئے جداگانہ انتخابات برقرار رکھنے کے ساتھ ساتھ سکھوں ور اچھوتوں کو بھی یہ حق دیا گیا۔ ہندو اکثریت والے صوبوں میں مسلمانوں کو آبادی سے زیادہ نشستیں دی گئیں اور بنگال اور پنجاب میں مسلمانوں کو آبادی کے تناسب سے کم نشستیں ی گئیں۔ مرکزی اسمبلی میں اُن کے لئے ایک تہائی تعداد مخصوص کر دی گئی اور سندھ و بمبئی سے الگ کر دیا گیا۔

کانگرس نے کیمونل ایوارڈ کو صریحاً مسترد کر دیا۔ لیکن حضرت اقبال سمجھوتہ پر تیار ہو گئے۔

---

[۵] اقبال کے آخری دو سال ص ۱۷-۱۶

اُن کا یہ خیال تھا کہ " وہ فرقہ وارانہ مسائل جن کا تصفیہ ہو چکا ہے اُنہیں دوبارہ شروع نہیں کرنا چاہیئے۔ سندھ کی بمبئی سے علیحدگی، صوبہ سرحد میں آئینی اصلاحات کا نفاذ اور مسلمانوں کے لئے جُداگانہ انتخابات اب قطعی طور پر متعین ہو چکے ہیں۔ پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کے لئے اکثریت حاصل کرنا ہی واحد حل طلب مسئلہ ہے" لے

انہوں نے مزید فرمایا (یہ بیان کیمونل ایوارڈ کے اعلان کے ساتھ ہی جاری کیا گیا) "میری یہ دیانتدارانہ رائے ہے کہ کسی بھی فرقے کو مسلمانوں سے بڑھ کر اس فیصلے سے رنجش نہیں پہنچی۔ یقیناً میں خود بھی اس کی وضاحت نہیں کر سکتا کہ برطانوی ضمیر نے اس ناانصافی کو کس طرح برداشت کر لیا ہے۔"

۲۱ر مارچ ۱۹۳۲ء کو حضرت اقبال نے آل انڈیا مسلم کانفرنس جو لاہور میں منعقد ہوئی اُس میں شرکت کی۔ اس سے پہلے وہ ۱۹۳۱ء میں مسلم زعماء کی کانفرنس منعقدہ بھوپال میں شرکت کر چکے تھے۔ لاہور والی کانفرنس میں انہوں نے فرمایا۔

" سخت ہو جائیں اور سخت محنت کریں۔ یہی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا کُلی راز ہے ہمارا نصب العین یقین ہے۔ ہمیں اسلام کے لئے آنے والے آئین میں وہ مقام حاصل کرنا ہے جو اس ملک میں اس کی قسمت بدلنے کے لئے مواقع پیدا کرے گا۔"

لیکن یہ کس طرح ممکن تھا؟ حضرت علامہؒ کا خیال تھا کہ لائحہ عمل " جزدی طور پر سیاسی اور جُزدی طور پر ثقافتی ہونا چاہیئے۔"

اولاً:۔ مسلمانوں کو " ایک سیاسی تنظیم میں شمولیت کرنا چاہیئے۔ اس کی ملک بھر میں صوبائی اور ضلعی شاخیں ہوں۔" اس کا نام چاہے کچھ ہی ہو لیکن اس کا آئین اتنا لچکدار ہو کہ " ہر سیاسی مکتب فکر کے لئے یہ ممکن ہو کہ وہ برسرِ اقتدار آ سکے اور اپنے خیالات اور طریقوں سے قوم کی رہنمائی کرے۔" یہ مختلف نظریات کے درمیان ناچاقی کو ناممکن بنا دے گا۔ اور ہندوستان میں اسلام کے بہترین مفادات کے لئے ہماری مُنتشر قوتوں کو از سرِ نو یکجا کرنے کے ساتھ اُن میں نظم پیدا کرے گا۔"

ثانیاً:۔ حضرت علامہؒ نے کانفرنس سے " پچاس لاکھ روپے کے قومی فنڈ" اکٹھا کرنے کی بھی سفارش کی۔ یہ رقوم مسلمانوں کی سیاسی تنظیم کو منظم کرنے پر خرچ کی جائیں گی

لے:۔ انقلاب ۳ر جنوری ۱۹۳۲ء

ثالثاً:۔ "مرکزی تنظیم کی نگرانی اور رہنمائی میں ملک بھر میں نوجوانوں کی لیگیں تشکیل دی جائیں جس کے رضا کار اچھی طرح ساز و سامان سے لیس ہوں"۔ یہ نوجوان خود کو مسلمانوں کی معاشرتی خدمت، ثقافتی اصلاح اور تجارتی تنظیم کے لئے وقف کر دیں۔ جہاں تک مسلمان کسانوں کا ہندو مہاجنوں سے بھاری قرضے لینے کا تعلق ہے تو حضرت علامہ نے فرمایا کہ وہ "نقطۂ زوال پر پہنچنے والے ہیں جیسا کہ ۱۹۲۵ء میں چین میں ہوا جب وہاں کسان لیگیں معرضِ وجود میں آگئیں۔"

حضرت علامہ کی یہ رائے تھی کہ برّصغیر میں اسلام کا مستقبل پنجاب میں مسلمان کسانوں کی آزادی پر منحصر ہے۔ نوجوانوں کو کسانوں کو "اُن کی موجودہ غلامی سے بچنے کے لئے دیہاتی گروہ کی" مدد کرنی چاہیئے۔

حضرت علامہ نے مسلمانوں کے ثقافتی مسائل کو زیرِ بحث لاتے ہوئے تجویز پیش کی کہ "ہندوستان کے تمام بڑے قصبوں میں مردوں اور خواتین کے لئے ثقافتی ادارے" قائم کئے جائیں۔ ان اداروں کو سیاست سے کلیتہً اجتناب کرنا چاہیئے اور نوجوان نسل کو یہ احساس دلانا چاہیئے کہ "اسلام جو کچھ پہلے ہی حاصل کر چکا ہے اور بنی نوع انسان کی مذہبی اور ثقافتی تاریخ میں اسے ابھی کیا حاصل کرنا ہے"۔ ان ثقافتی اداروں کو مشورہ دیا گیا کہ وہ پرانے اور نئے مسلم تعلیمی مراکز کے ساتھ عقلی تعلق قائم رکھیں "تاکہ" واحد مقصد کے لئے تعلیمی سعی کے تمام خطوط کا قطعی جُھکاؤ حاصل کیا جا سکے"۔

آخر میں حکیم الامتؒ نے علماء کرام کی ایک مجلس کے قیام کی تجویز پیش کی جس میں ایسے مسلم وکلاء بھی شامل ہوں جنہوں نے جدید قانونیات میں تعلیم حاصل کی ہے"۔ اس مجوزہ مجلس کو "جدید حالات کی روشنی میں اسلام کے قوانین کی حفاظت اور توسیع کے ساتھ، اگر ضروری ہو، تو تشریح کرنا تھی"۔ حضرت علامہ نے علمائے کرام کی اس مجوزہ مجلس کی حیثیت کو قانونی طور پر تسلیم کرنے کی سفارش کی۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ "مسلمانوں کے نجی قانون کو متاثر کرنے والا کوئی بِل بھی لیجسلٹو اسمبلی پر نہ رکھا جائے جب تک کہ وہ اس مجلس کی کٹھالی سے نہ گذرے"۔

گول میز کانفرنس کا تیسرا دور، ۱۷ نومبر سے ۲۴ دسمبر ۱۹۳۲ء تک رہا۔ حضرت علامہ نے اس میں شرکت کی، جب کہ محمد علی جناح کو حکومت نے مدعو ہی نہ کیا۔ کانگرس کے

رہنما تحریک سول نافرمانی کی وجہ سے جیلوں میں بند تھے۔ یہ مختصر دور مختلف کمیٹیوں کی رپورٹوں کی جانچ پڑتال کے بعد ختم ہو گیا۔

جولائی ۱۹۳۵ء میں لاہور میں سکھوں نے مسجد شہید گنج کو مسمار کر دیا۔ مسلمانوں کے لئے سب سے بڑا مسئلہ اس کی داگذاری کا تھا۔ ۲۱ فروری ۱۹۳۶ء کو محمد علی جناح اس قضیئے کا حل تلاش کرنے کے لئے لاہور تشریف لائے۔ اپنی ۷ مارچ کو دہلی واپسی سے پہلے انہوں نے شہید گنج مصالحتی بورڈ کے نام سے ایک کمیٹی تشکیل دی تھی جس کے ارکان درج ذیل اصحاب تھے۔

علامہ اقبال۔ میاں عبدالعزیز بیرسٹرایٹ لا۔ مولوی عبدالقادر قصوری، سردار بوٹا سنگھ ایڈوکیٹ۔ پنڈت نانک چند بیرسٹرایٹ لا، راجہ نریندر ناتھ، سردار اجل سنگھ، سردار سمپورن سنگھ۔ میاں احمد یار خان دولتانہ (کنوینر)

حضرت علامہ کے مشورے سے مسٹر سیل کے ۲۵ مئی ۱۹۳۶ء کے فیصلے کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل کی گئی۔ ۳۰ نومبر ۱۹۳۷ء کو لاہور کی ہائی کورٹ کے فل بنچ کے روبرو شہید گنج کی اپیل پیش ہوئی۔ یہ بنچ چیف جسٹس ینگ، جسٹس بھڈے اور جسٹس دین محمد پر مشتمل تھا۔ عدالتِ عالیہ نے چند ایسے نکات اٹھائے اور مسلمانوں کو بیرون پنجاب سے کسی اچھے قانون دان کی خدمات حاصل کرنے کی بھی اجازت دیدی۔

حضرت علامہ چاہتے تھے کہ مسٹر جناح کو زحمت دی جائے چنانچہ اُن کو ۱۹ دسمبر کو غلام رسول خاں نے حضرت علامہ کے ایماء سے درجِ ذیل خط لکھا:۔

"ڈیئر مسٹر جناح! شہید گنج کی اپیل اب ایک نہایت اہم منزل پر پہنچ گئی ہے۔ ہائی کورٹ کے سامنے بحث مکمل ہو چکی ہے۔ عدالت عالیہ نے بحث سُننے کے بعد چند نئے تنقیح طلب اُمور مرتب کئے ہیں۔ یعنی یہ کہ کیا مسجد کے انہدام سے از سرِ نو میعاد شروع ہوتی ہے۔ اور کیا حکم امتناعی کے اجراء کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے اور کیا ایسے حکم امتناعی کا اجراء ہو جانا چاہیئے۔

لاہور کے مسلمانوں کی خواہش ہے کہ اب اُمید کی ایک کرن پھوٹتی نظر آئی ہے۔ آپ خود یہاں تشریف لائیں تاکہ اس عمارت کی آخری اینٹ آپ کے مضبوط ہاتھوں سے رکھی جائے۔ ہماری اور مسلمانانِ لاہور کی طرف سے

ملک برکت علی آپ سے ملنے کے لئے بمبئی حاضر ہوں گے اور تفصیل سے زبانی سب کچھ عرض کریں گے۔

آپ پہلے بھی اُس وقت لاہور تشریف لائے تھے جب تحریک شہید گنج ایک نہایت نازک مرحلے سے گذر رہی تھی اور آپ ہی کی کوششوں سے وہ مرحلہ بخیر و خوبی طے ہو گیا تھا۔ اب شہید گنج کی بازیابی کا دعویٰ بھی ایک بہت نازک مرحلے پر پہنچ گیا ہے۔ یقین کیجئے گا کہ آپ کے یہاں تشریف لانے اور نئے اُمور پر عدالت عالیہ کے رُوبرو بحث کرنے سے صرف پنجاب نہیں بلکہ پورے ہندوستان کے مسلمان آپ کے احسان مند ہوں گے جو تاریخ آپ پسند فرمائیں گے، عدالت کو وہ تاریخ مقرر کرنے میں کوئی عذر نہیں ہو گا۔ کیونکہ جب ملک برکت علی نے عدالت عالیہ سے یہ درخواست کی تھی کہ مزید بحث کے لئے بیرون پنجاب سے کسی قانون دان کو بلانے کی ضرورت محسوس ہو گی تو آنریبل چیف جسٹس نے بخوشی اس امر کی اجازت عطا کر دی تھی۔

میں یہ بھی عرض کروں گا کہ آپ کی تشریف آوری سے ہمارے صوبے میں مسلم لیگ کی تحریک میں نئی جان پڑ جائے گی۔ اس لئے مجھے اُمید ہے کہ آپ میری اس نیازمندانہ گذارش پر توجہ فرمائیں گے۔

آپ کا مخلص

"غلام رسول"

کرسمس کی تعطیلات کے دوران میں ملک برکت علی اور عاشق حسین بٹالوی بمبئی روانہ ہو گئے۔ مسٹر جناح نے دورانِ ملاقات میں اُن کو بتایا کہ فروری ۱۹۳۶ء میں جب وہ ثالث کی حیثیت سے لاہور گئے تھے تو سکھوں اور ہندوؤں نے بھی بڑی گرم جوشی سے اُن کو خوش آمدید کہا تھا اور اب اس تنازعے میں ایک فریق کا وکیل بن کر جانا کسی طرح بھی مناسب نہ رہے گا۔ اور بمبئی کے ایک انگریز بیرسٹر مسٹر الیگزنڈر کولٹ مین کی خدمات حاصل کرنے کا مشورہ دیا۔

۱۰ جنوری ۱۹۳۸ء کو عدالت عالیہ میں تنازعے پر مزید بحث ہوئی۔ مسٹر کولٹ مین

مسلمانوں کی طرف سے پیش ہوئے۔ ۲۶ جنوری کو فیصلہ سنایا گیا اور اپیل خارج کر دی گئی۔ ۳۰ جنوری کو آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا اجلاس دہلی میں منعقد ہوا تاکہ صورتِ حال کا جائزہ لیا جا سکے۔ یکم فروری کو ہندوستان بھر میں یوم شہید گنج منانے کا فیصلہ کیا گیا اور جلسے منعقد کر کے قرار دادیں منظور کرنے کی تاکید کی گئی۔ حضرت علامہ ایسے اقدامات سے بڑھ کر یہ چاہتے تھے کہ ایسا قانون ہی ختم ہونا چاہیئے۔ اُنہوں نے ملک برکت علی کو مساجد کی حُرمت کے متعلق مسودہ قانون پنجاب اسمبلی میں پیش کرنے کی ہدایت کی۔ کچھ لوگوں کی یہ رائے تھی کہ ہائی کورٹ کے فیصلے کے خلاف پریوی کونسل میں اپیل کی جائے۔ لیکن حضرت علامہ یہ محسوس کر رہے تھے کہ مسجد واگذار ہو سکتی ہے تو زور بازو سے۔ قانونی چارہ جوئی کرنے کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ ؎

مومناں را گفت آں سلطانِ دیں — مسجد من ایں ہمہ روئے زمیں
الاماں از گردش نہ آسماں — مسجد مومن بدست دیگراں
سخت کوشد بندہ پاکیزہ کیش — تا بگیرد مسجد مولائے خویش

مارچ ۱۹۳۳ء میں برطانوی حکومت نے ایک قرطاس ابیض جاری کیا جس میں بعض آئینی تجاویز کا جائزہ لیا گیا۔ بعد ازاں انہی تجاویز کی بنیاد پر ۲۴ جولائی ۱۹۳۵ء کو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ منظور کیا۔ لیکن اس کی رُو سے بھی ہندوستان کو درجۂ نوآبادیات حاصل نہ ہو سکا۔ حسبِ سابق برطانوی پارلیمنٹ ہی ہندوستانی اُمور کی کرتا دھرتا رہی۔ مرکز میں دوعملی کا نظام رائج کیا گیا۔ وائسرائے کے اختیارات میں مزید اضافہ کر دیا گیا۔

حضرت علامہ نے اس ایکٹ پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ "دستور جدید سارے ہندوستان کو ایک ہی وفاق میں مربوط کر لینے کی تجویز حد درجہ یاس انگیز ہے"۔ انہوں نے اس ایکٹ کی اس بنا پر مخالفت کی کیونکہ اس نے صوبوں کو صرف خود مختاری دی۔ اگرچہ برطانوی حکومت اسے حکومت خود اختیاری کی تکمیل خیال کرتی تھی۔ حضرت علامہ کو اس کی وفاقی دفعات پر بھی اعتراض تھا کیونکہ اس سے یہاں کی نوآبادیاتی حیثیت پر کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ حکیم الامت نے خود کو ایسے لوگوں سے الگ کر لیا جنہوں نے اس کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیئے تھے۔ انہوں نے ہندوستان کو ایک ایسے پرندے سے تشبیہ دی جو پنجرے میں مقید ہو۔ نیا آئین اُس کی آزادی کا پیغام لے کر نہیں آیا تھا بلکہ

اُسے محض لوری دینے کی کوشش تھی۔

سنہ ۱۹۳۲ء سے لے کر اپنی رحلت تک حضرت علامہ نے پنجاب میں مسلم لیگ کی از سرِ نو تنظیم میں زبردست تگ و دو کی۔ جلسوں میں انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ وہ دوسری مسلم اور غیر مسلم جماعتوں کے ساتھ تعلقات منقطع کر لیں تاکہ متحدہ محاذ قائم ہو سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ لیگ کی دونوں شاخوں کو متحد کرنے اور مسلم کانفرنس کو لیگ میں مدغم کرنے میں حضرت علامہ کا بڑا حصہ تھا۔ محمد علی جناح یہاں کی سیاست سے دل برداشتہ ہو کر لندن چلے گئے اور وہاں مکان خرید کر مستقل رہائش کا ارادہ فرمایا۔ ۱۹۳۴ء میں اُنہیں اس بات پر آمادہ کیا گیا کہ وہ برصغیر واپس آجائیں۔ انہوں نے واپسی پر لیگ میں دوبارہ رُوح پھونکنے کا بیڑا اُٹھایا۔

۱۹۳۵ء کے قانون حکومتِ ہند کے نفاذ کے بعد مسلم لیگ سمیت تمام سیاسی جماعتیں آئندہ منعقد ہونے والے انتخابات کی تیاریوں میں مصروف ہو گئیں۔

۱۹۳۶ء میں مسلم لیگ نے اپنے اجلاس منعقدہ بمبئی میں محمد علی جناح کو یہ اختیار دیا کہ وہ ایک مرکزی پارلیمانی بورڈ کی تشکیل کریں۔ لیکن انہیں کسی صوبے سے بھی تعاون حاصل نہ ہوا اور کوئی مسلم قائد بھی لیگ کے مُردہ جسم میں جان ڈالنے میں اُن کا ہاتھ بٹانے کو تیار نہ تھا۔ اس وقت مسلمانوں کا اتحاد پارہ پارہ ہو چکا تھا جیسا کہ ایک مصنّف رقمطراز ہے:۔

"اس وقت تمام اندھیرے میں لاہور میں صرف ایک ٹمٹماتی ہوئی روشنی تھی"

یہ حضرت علامہ تھے اس طرح حضرت علامہ کے کئی مخالفین بھی پیدا ہو گئے جو زمیندار تھے یا اُن کے قائدین بشمول سر فضل حسین اور سردار سکندر حیات خان

۲۹ر اپریل ۱۹۳۶ء کو مسٹر محمد علی جناح لاہور تشریف لائے تاکہ قرار داد بمبئی کے مطابق پنجاب میں بھی ایک پارلیمانی بورڈ قائم کیا جائے۔ یونینسٹ رہنماؤں نے اُن سے گفت و شنید کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ یکم مئی کو اُنہوں نے سر فضل حسین سے اُن کے مکان پر ملاقات کی وہ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے رُکن کی حیثیت سے اپنے عُہدہ کی مدت ختم کرنے کے بعد پنجاب واپس آچکے تھے۔ محمد علی جناحؒ نے انہیں مسلم لیگ کی طرف سے پنجاب پارلیمانی بورڈ

کی تشکیل کے لئے کہا لیکن موخر الذکر نے صاف انکار کر دیا اور تُرش لہجے میں مسٹر جناح کو پنجاب چھوڑ کر چلے جانے کو کہا۔ مایوس ہو کر مسٹر جناح حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور امداد و اعانت کی درخواست کی۔ جناب عاشق حسین بٹالوی نے جناب فضل کریم درانی (مالک مسٹر وکھ اخبار اور انگریزی کے انشاء پرداز) کے حوالہ سے اس ملاقات کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:-

"مسٹر جناح اپنی روائتی جامہ زیبی اور خوش پوشی کا ایک دلآویز مُرقع بنے ہوئے تشریف لائے۔ اعلیٰ درجہ کی ولایتی دکان کا سِلا ہوا بیش قیمت سوٹ پہن رکھا تھا اور چال جیسے کڑی کمان کا تیر۔ ادھر ڈاکٹر صاحب کی درویشی اور بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ جسم پر سوائے بنیان اور دھوتی کے اور کوئی چیز نہ تھی۔ جب گفتگو شروع ہوئی تو ڈاکٹر صاحب نے امداد کا پورا وعدہ کیا اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ اگر آپ اودھ کے تعلقہ داروں یا بمبئی کے کروڑ پتی سیٹھوں کی قسم کے لوگ پنجاب میں تلاش کریں گے تو یہ جنس میرے پاس نہیں۔ میں صرف عوام کی مدد کا وعدہ کر سکتا ہوں"

یہ بات سُن کر مسٹر جناح کرسی سے ذرا نیچے اوپر اٹھے اور بڑے جوش سے کہنے لگے "مجھے صرف عوام کی مدد درکار ہے"

اگرچہ ان دنوں حضرت علامہ بیمار تھے، ان کی اہلیہ محترمہ کا انتقال کوئی سال پہلے ہوا تھا اور دونوں بچوں کی تربیت و پرورش کی ذمہ داری اُن کے کندھوں پر آن پڑی تھی۔ سب سے بڑھ کر یہ چیز قابل غور ہے کہ وہ اُن دنوں پریکٹس بھی نہ کرتے تھے اور آمدنی کا کوئی دوسرا ذریعہ نہ تھا۔ لیکن ان حالات کے باوجود انہوں نے مسٹر جناح کو بھرپور اعانت کا وعدہ فرمایا اور ہم دیکھتے ہیں کہ انہوں نے اپنے وصال تک مسٹر جناح کی قیادت میں دن رات مسلمانوں کی خدمت کی وہ کہا کرتے تھے کہ "مسٹر جناح ہی مسلمانوں کے اصل لیڈر ہیں اور میں تو اُن کا ایک معمولی سپاہی ہوں" حضرت علامہ تین برس تک پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے رُکن رہے، کونسل کے اندر رہ کر انہوں نے مسلمانوں کے نفاق اور عصبیت کا بغور مطالعہ کیا تھا۔ بعض خود غرض اور طالع آزما رہنماؤں نے دیہی اور شہری تفریق پیدا

رد تھی۔ اگر ایک طرف انگریز کی ہوس ملوکیت کا شیر منہ کھولے کھڑا تھا تو دوسری طرف انڈین نیشنل کانگرس کی ہوس ملک گیری کا اژدھا مسلمانوں کو نگل جانے کے لیے موقع کی تلاش میں تھا۔ مسلمانوں کی آزادی کا حصول وہ مقصد تھا جس کے تحت حضرت علامہؒ نے مسٹر جناح کی طرف دستِ تعاون بڑھایا۔

۸ مئی ۱۹۳۶ء کو حضرت علامہ اور اُن کے حامیوں (ملک برکت علی، خلیفہ شجاع الدین، غلام رسول خان اور پیر تاج الدین) نے ایک مشترکہ بیان جاری کیا جس میں یہ کہا گیا: "مسٹر جناح کی بے نفسی اور دور اندیشی کی داد دینا چاہیئے کہ انہوں نے ایسے موقع پر مسلمانوں کی رہنمائی کی ہے جب گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت نئے انتخابات کا وقت قریب آ رہا ہے۔ مسٹر جناح کے اس اقدام سے وہ غرض پرست اور رجعت پسند حلقے بدحواس ہیں جو اب تک مسلمانانِ ہند کی قیادت کا غلط دعویٰ کر کے اپنی مطلب براری کرتے رہے ہیں۔ یہ کھلبلی، یہ اضطراب اور یہ پریشانی ہمارے نزدیک کچھ غیر متوقع نہیں۔ مسٹر جناح نے مسلمانوں کی تنظیم کا جو بیڑہ اُٹھایا ہے اس کے ساتھ ان خود غرض قائدین کی قیادت کا فریب طشت از بام ہو جائے گا کیونکہ مسلمان اب آنے والے انتخابات میں اپنے سچے نمائندوں کو منتخب کریں گے۔

اندریں حالات ہمیں یہ دیکھ کر قطعاً تعجب نہیں ہوا کہ بعض اخباروں نے مسٹر جناح کی ناکامی کی فرضی اور بے بنیاد داستانیں وضع کر کے شائع کرنا شروع کر دی ہیں ان اخبارات کا یہ بیان کہ پنجاب میں سوائے احرار لیڈروں کے اور کسی جماعت نے مسٹر جناح کا ساتھ دینا گوارا نہیں کیا۔ ایک صریح جھوٹ ہے۔

"ہمیں یہ کہنے میں ذرا بھر تامل نہیں کہ مذکورہ بالا اخبارات کے اس قسم کے بیان صرف غلط ہی نہیں بلکہ گمراہ کن بھی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہماری قوم کو مسٹر جناح کی دیانتداری، امانت اور سیاسی بصیرت پر ایسا پختہ اعتماد ہے کہ مسلمانانِ پنجاب کے تمام طبقوں نے یک آواز مسٹر جناح کی تجویز کو لبیک کہنے سے دریغ نہیں کیا۔ پنجاب کے مسلمان مسٹر جناح کی اس تجویز کے دل سے حامی ہیں کہ آئندہ صوبے کی اسمبلی میں ایسے خود دار، خود اعتماد اور محبِ وطن نمائندوں کو بھیجا جائے، جو اگر ایک طرف مسلمان قوم کے حقوق کا خاطر خواہ

تحفظ کریں تو دوسری طرف ایوان کے دیگر ترقی پسند اراکین کے ساتھ مل کر رائے عامہ کا وقار بھی قائم کر سکیں۔

ہمیں اس امر کا پورا احساس ہے کہ مسٹر جناح کی یہ تجویز جداگانہ انتخاب کا لازمی نتیجہ اور تتمہ ہے۔ اس لئے ہم اُن کو یقین دلاتے ہیں کہ جس اہم کام کی ابتداء انہوں نے کی ہے ہم اس کو تکمیل تک پہنچانے میں دل و جان سے اُن کے حامی ہیں۔"[1]

۱۲ مئی کو مسلم لیگ نے بیرون یکی گیٹ ایک خصوصی اجلاس کا اہتمام کیا۔ جلسہ کی صدارت حضرت علامہ نے کی۔ ایک قرارداد کے ذریعہ حضرت علامہ کو صدر، ملک برکت علی اور خلیفہ شجاع الدین کو نائب صدر، غلام رسول خان کو سیکرٹری اور میاں عبدالمجید اور عاشق حسین بٹالوی کو جائنٹ سیکرٹری منتخب کیا گیا۔ یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ پنجاب مسلم لیگ مرکزی پارلیمانی بورڈ اور اس کی پالیسیوں کی حمایت کرے گی۔ علاوہ ازیں برطانیہ کی فلسطین میں عرب دشمنی کے خلاف احتجاج کیا گیا۔

غیر متوقع طور پر محمد علی جناح نے مقامی مسلم جماعتوں۔ مجلس احرار اور اتحاد ملت کو اپنا ہمنوا بنا لیا تھا۔ اگرچہ دونوں جماعتوں میں شہید گنج کے واقعہ پر سخت اَن بَن تھی ۱۲ مئی کو محمد علی جناح نے اپنے قیام سری نگر کے دوران میں مرکزی پارلیمانی بورڈ کے اراکین کا اعلان کیا۔ ان کی تعداد ۵۶ تھی۔ جن میں ہندوستان کے ہر صوبے کے نمائندے شامل تھے۔ پنجاب کے لئے گیارہ اراکین منتخب کئے گئے حضرت علامہ سرفہرست تھے۔ باقی اصحاب کے نام درجِ ذیل تھے:۔

مولانا ظفر علی خان (اتحاد ملت) مولانا محمد اسحاق مانسہروی (اتحاد ملت) سیّد زین العابدین شاہ گیلانی (اتحاد ملت) میاں عبدالعزیز بیرسٹر ایٹ لاء (لیگ) مولانا عبدالقادر قصوری (لیگ) راجہ غضنفر علی خان (لیگ) شیخ حسام الدین (احرار) چوہدری افضل حق (احرار) چوہدری عبدالعزیز بیگووال (احرار) خواجہ غلام حسین ایڈووکیٹ (احرار)

---

[1] Civil and Military Gazette. Lahore, 9 5.1936.

احرار کا یہ خیال تھا کہ آنے والے انتخابات میں اُن کو لیگ سے مالی امداد ملے گی۔ لیکن جب اُن کو اس کی اُمید نہ رہی تو انہوں نے اس سے اپنے تعلقات منقطع کر لئے۔ چند ہفتوں میں ہی مولانا ظفر علی خان جو اتحاد ملّت کے صدر تھے، بھی منحرف ہو گئے کیونکہ اُن کا گروپ احرار جتنی نشستیں بھی حاصل نہ کر سکا۔ اتحاد ملّت اور احرار دونوں نے ہی لیگ کے خلاف انتخاب میں حصہ لیا۔

۲۳ مئی کو حضرت علامہ نے محمد علی جناحؒ کو درجِ ذیل مراسلہ بھیجا:[1]

لاہور۔ ۲۳ مئی ۱۹۳۶ء

ڈیئر مسٹر جناح!

ابھی ابھی آپ کا عنایت نامہ موصول ہوا۔ اس کا شکریہ قبول کیجئے۔ مجھے یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ آپ کا کام آگے بڑھ رہا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ پنجاب کی پارٹیاں خاص کر احرار پارٹی اور اتحاد ملّت پارٹی کچھ ہچر مچر کے بعد آخر الامر آپ کے ساتھ شریک ہو جائیں گی۔ اتحاد ملّت پارٹی کے ایک بڑے سرگرم و فعال رُکن نے ابھی چند روز ہوئے مجھے یہ بات بتائی ہے۔ مولانا ظفر علی خان کے رویّے کے بارے میں خود اتحاد ملت والے کچھ بہت زیادہ وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ وہ کدھر کا رُخ کریں گے۔ بہرنوع وقت کافی ہے۔ اور نہیں عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ رائے دہندگان اسمبلی میں اتحاد والوں کے آدمی بھیجنے کی بابت کیا خیال ظاہر کرتے ہیں۔ اُمید ہے کہ آپ کے مزاج بخیر ہوں گے۔ آپ سے ملاقات کا آرزومند۔

آپ کا مخلص

اقبال

۲۸ مئی کو حضرت علامہ نے مسلم لیگ کا ایک اجلاس اپنی رہائش گاہ پر بُلایا جس میں مرکزی پارلیمانی بورڈ کے پنجابی اراکین کے علاوہ خلیفہ شجاع الدین، ملک برکت علی

---

[1]:۔ اقبال کے خطوط جناح کے نام (شیخ محمد اشرف لاہور)

سید محمد علی جعفری غلام رسول خان بیرسٹر ایٹ لاء ملک نور الٰہی روزنامہ احسان ۔ شیخ اکبر علی ایڈوکیٹ، پیر تاج الدین بیرسٹر ایٹ لاء ، پیر نور احمد ، میاں عبد المجید بیرسٹر ایٹ لاء اور عاشق حسین بٹالوی نے شرکت کی ۔

اس اجلاس کی صدارت حضرت علامہ نے کی ۔ اجلاس میں دو قرار دادیں منظور کیں پہلی قرار داد پنجاب میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر انتخاب لڑنے کے لئے ایک صوبہ پارلیمانی بورڈ کے قیام سے متعلق تھی ۔ اور دوسری قرار داد مجوزہ پارلیمانی بورڈ کے قواعد و ضوابط مرتب کرنے سے تعلق رکھتی تھی ۔

حضرت علامہ کو اطلاع ملی کہ ۶ر جون کو محمد علی جناح کشمیر سے واپس لاہور پہنچ رہے ہیں اور یہ کہ یونینسٹ پارٹی سیاہ جھنڈیوں سے اُن کا استقبال کرے گی ۔ حضرت علامہ نے ملک لال دین قیصر کے ذریعہ یونینسٹ پارٹی کے کچھ اراکین کو خبردار کیا کہ ایسا کرنے سے جو نتائج پیدا ہوں گے ، وہ خود ہی اُن کے ذمہ دار ہوں گے ۔ یہ "دھمکی" اثر کر گئی اور محمد علی جناح کے سیاہ جھنڈیوں سے استقبال کا ارادہ ترک کر دیا گیا جو بعض چھچھورے نوجوانوں کے ذہن کی اختراع تھا ۔

حضرت علامہ نے مسلم لیگ کی از سر نو تنظیم سے متعلق امور میں کس قدر دلچسپی لی تھی ۔ اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ ۸ر جون کو مسلم لیگ کونسل اور پارلیمانی بورڈ کے اجلاس کی جگہ کا تعین کرنا مقصود تھا ۔ حضرت علامہ کی انجمن حمایت اسلامیہ پر بے شمار عنایات تھیں لیکن اس کے صدر نواب مظفر خان نے حضرت علامہ کی حبیبیہ ہال (اسلامیہ کالج) کو استعمال کرنے کی خواہش کا احترام نہ کیا کہ وہ یونینسٹ پارٹی کے ایک اہم رکن تھے ۔ مجبوراً برکت علی اسلامیہ ہال میں اجلاس منعقد کئے گئے ۔ پنجاب لیگ کے اس اجلاس نے حضرت علامہ کو دوبارہ لیگ کا صدر منتخب کیا ۔

اس دوران میں حضرت علامہ نے بیماری اور نقاہت کے باوجود محمد علی جناح کے ساتھ مسلسل رابطہ قائم رکھا ۔ اپنے ۹ر جون کے مراسلہ میں انہوں نے لکھا (یہ مراسلہ دستی بھیجا گیا کیونکہ مسٹر جناح لاہور میں ہی تشریف رکھتے تھے)[1]

---

[1] اقبال کے خطوط جناح کے نام (شیخ محمد اشرف لاہور)

ڈیئر مسٹر جناح!

میں نے جو مسودہ مرتب کیا ہے وہ آپ کو بھیج رہا ہوں۔ اس کے ساتھ کل کے "ایسٹرن ٹائمز" اخبار کا تراشہ بھی بھیج رہا ہوں، یہ گورداسپور کے ایک قابل وکیل کا خط ہے۔

مجھے اُمید ہے کہ بورڈ کی جانب سے جو بیان جاری کیا جائے گا اس میں اسکیم کی پوری تفصیل موجود ہوگی اور ساتھ ہی اس وقت تک اسکیم پر جو اعتراضات ہوتے رہے ہیں اُن کا شافی جواب بھی دیا جائیگا اس بیان میں لگی لپٹی رکھے بغیر مسلمانانِ ہند کی موجودہ پوزیشن کا جو حکومت اور ہندوؤں کے ضمن میں ہے۔ واضح اور صاف صاف اعلان ہونا چاہیئے۔ اس بیان میں یہ انتباہ بھی ہونا چاہیئے کہ اگر مسلمانانِ ہند نے موجودہ اسکیم کو منظور نہیں کیا تو وہ نہ صرف جو بھی کچھ گذشتہ پندرہ سالوں میں حاصل کر چکے ہیں اسے بھی کھو دیں گے بلکہ اپنا شیرازہ خود اپنے ہاتھوں سے درہم برہم کر دیں گے اور خود اپنے لئے خسارے کا باعث ہوں گے۔

آپ کا مخلص

اقبال

مکرر: اخبارات کو بھیجنے سے قبل اگر بیان مجھے بھیج سکیں تو عین عنایت ہوگی۔ بیان میں ایک اور نکتہ جو واضح کیا جائے، یہاں پیش کرتا ہوں:-

۱- مرکزی اسمبلی کے لئے بالواسطہ طریق انتخاب نے یہ بات قطعی طور پر ضروری بنا دی ہے کہ جو اراکین صوبائی اسمبلیوں کے لئے منتخب کئے جائیں وہ ایک کُل ہند مسلم پالیسی اور پروگرام کے پابند ہوں تاکہ وہ مرکزی اسمبلی کے لئے جو نمائندے چُنیں وہ ایسے لوگ ہوں جو مرکزی اسمبلی میں اسلامی ہند کے ان مرکزی مسائل کی تائید و حمایت کریں اور اپنی حیثیت اس طرح منوائیں جس سے معلوم ہو کہ وہ ہندوستان کی دوسری بڑی قوم ہیں۔ اس وقت جو لوگ صوبائی پالیسیوں اور پروگراموں کے طرفدار بنے ہوئے ہیں۔ یہ وہی تو ہیں جو

مرکزی اسمبلی کے لئے بالواسطہ انتخاب کا طریقہ آئین میں منظور کرانے کے لئے آلہ کار بنے رہے تھے اور یہ بالکل ظاہر ہے کہ ایک غیر ملکی حکومت کے مفاد اس ہی سے پورے ہوتے تھے۔ اب جبکہ ہماری قوم اس بدبختی (بالواسطہ انتخاب) سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی فکر میں ہے تو اس نے انتخاب کے لئے ایک کُل ہند اسکیم طے کی ہے (یعنی لیگ کی اسکیم جس کی پابندی پر صوبائی اُمیدوار کرے گا۔ اب یہی لوگ پھر اس بات کے درپے ہیں اور وہ بھی ایک غیر ملکی حکومت کے اشارے پر، کہ قوم کی حیثیت سے مسلمانوں کو استحکام نصیب ہونے کے مقصد کو کس طرح زک دی جائے۔

۲- اسلامی اوقاف (جیسا کہ مسجد شہید گنج نے ضرورت کا احساس کرایا ہے) سے متعلق قانون اور اسلامی ثقافت، زبان، مساجد اور قانونِ شریعت سے متعلق مسائل پر بھی توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

اپنے ۲۵ جون کے مراسلے میں حضرت علامہ نے محمد علی جناح کو لکھا:۔[1]

"سر سکندر حیات دو ایک دن ہوئے لاہور سے روانہ ہو گئے۔ مجھے توقع ہے کہ وہ بمبئی میں آپ سے ملیں گے اور بعض اہم معاملات پر گفتگو کریں گے۔ دولتانہ کل مجھ سے ملنے آئے تھے وہ کہتے ہیں کہ یونینسٹ پارٹی کے مسلمان اراکین حسب ذیل اعلان کرنے کے لئے تیار ہیں۔"

"مسلمان من حیث القوم ایک کُل ہند اقلیت ہیں اس لئے جو مسائل ان کے مفاد سے متعلق ہوں گے ان کے لئے وہ لیگ کے فیصلے کے کُلیتہً پابند ہوں گے اور صوبائی اسمبلی میں کسی غیر مسلم گروپ کے ساتھ کوئی معاہدہ نہیں کریں گے۔" بشرطیکہ صوبائی لیگ بھی حسبِ ذیل اعلان کرنے کو تیار ہو۔ کہ جو لوگ مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کامیاب ہو کر پنجاب اسمبلی میں داخل ہوں گے وہ صرف اُس پارٹی یا گروپ کے ساتھ تعاون کریں گے جس میں مسلمانوں کی تعداد سب سے زیادہ ہو۔"

ازراہِ کرم اپنی پہلی فرصت میں مجھے مطلع فرمائیں کہ اس تجویز کے سلسلے

---

[1]: اقبال کے خطوط جناح کے نام (شیخ محمد اشرف لاہور)

میں آپ کی رائے کیا ہے؛ نیز یہ کہ سر سکندر سے آپ کی جو گفتگو ہوئی ہو اس سے بھی آگاہ فرمائیں۔ اگر آپ انہیں قائل کرنے میں کامیاب ہو گئے تو وہ ہماری طرف آجائیں گے۔

اُمید ہے کہ آپ کے مزاج بخیر ہوں گے۔"

سر سکندر حیات ایک موقع پرست شخص تھے اور مندرجہ بالا تجویز احمد یار خان دولتانہ اور سر سکندر حیات کی ملی بھگت تھی۔ ۹ جولائی کو جب سر فضل حسین کا انتقال ہوا تو سر سکندر حیات اور اُن کے احباب نے گھی کے چراغ جلائے[1]

اس موقع پر حضرت علامہ، ملک برکت علی اور میاں عبدالعزیز نے ایک مشترکہ بیان جاری کیا جس میں سر فضل حسین کی وفات پر ان الفاظ میں افسوس کا اظہار کیا گیا

"سر فضل حسین کی وفات حسرت آیات سے ہمارا صوبہ ایک حقیقی محبِ وطن کی خدمات سے محروم ہو گیا ہے۔ پنجاب کی پبلک زندگی سے اُن کا گہرا تعلق تھا اور اس تمام عرصہ میں ہر مرحلے پر فتح و کامرانی نے اُن کے قدم چومے۔ اُنہوں نے اپنی زندگی میں بہت سے معرکے سر کئے۔ لیکن یہ امر بے حد المناک ہے کہ عین جس وقت وہ اصلاحات جدیدہ کے تحت اپنا مستقبل مرتب کرنے کی تجویزیں سوچ رہے تھے، موت نے اُن کا رشتۂ حیات منقطع کر دیا۔ ہم اس سانحۂ عظیم میں اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کرتے ہیں کہ ہم سے ایک ایسا عظیم الشان لیڈر جُدا ہو گیا ہے جس کو قدرت نے سیاسیات کا صحیح شعور عطا کیا تھا۔ اور جو پارلیمانی قابلیت کے علاوہ تدبّر و معاملہ فہمی اور تعمیری کام کرنے کی صلاحیتوں کا بھی مالک تھا۔"[2]

حضرت علامہ نے ۲۳ اگست ۱۹۳۶ء کو محمد علی جناح کو درج ذیل مراسلہ بھیجا:۔

---

[1]:۔ ملاحظہ کریں اقبال کے آخری دو سال صہ ۳۳۴

[2] Civil and Military Gazette, *11.7 1936*.

مائی ڈیئر مسٹر جناح!

اُمید ہے کہ میرا خط وقت سے پہلے آپ کو مل گیا ہوگا۔ پنجاب پارلیمانی بورڈ اور یونینسٹ پارٹی کے درمیان کسی سمجھوتے کی باتیں سُننے میں آرہی ہیں۔ میری خواہش ہے اس قسم کی مفاہمت کے لئے آپ کے خیال میں کیا شرائط ہونی چاہئیں؟ مجھے اخبارات سے معلوم ہوا ہے کہ آپ نے بنگال پرجا پارٹی اور پارلیمانی بورڈ کے درمیان مفاہمت کرادی ہے۔ اس سلسلے میں شرائط اور ضوابط کیا طے ہوئے اس سے بھی مجھے ضرور مطلع فرمائیں۔ چونکہ بنگال میں پرجا پارٹی غیر فرقہ وارانہ ہے بالکل اسی طرح پنجاب میں یونینسٹ پارٹی ہے اس لئے آپ نے جو مفاہمت کرائی ہے وہ آپ کو مدد دے گی۔ ۔ ۔ ۔"

پنجاب میں حضرت علامہؒ نے علالت کے باوجود مسلم لیگ کو ہر دلعزیز بنانے میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ اُنہوں نے لیگ کے دفتر کو منظم کیا اور اضلاع میں اس کی شاخیں قائم کیں۔ اُنہوں نے اسے مقبول بنانے کے لئے دو ذیلی کمیٹیاں تشکیل دیں۔ ان میں سے ایک انتخابی پلیٹ فارم کے لئے مسودہ کمیٹی تھی اور دوسری پروپیگنڈا کمیٹی۔ اول الذکر خلیفہ شجاع الدین۔ شیخ محمد حسن، سیّد تصدق حسین، محمد اعظم خان ملک برکت علی۔ ملک زمان مہدی۔ غلام رسول خان۔ عاشق حسین بٹالوی اور مظفر علی خان قزلباش پر مشتمل تھی۔ اگرچہ مظفر علی قزلباش بعد میں لیگ سے علیحدہ ہو گئے پروپیگنڈا کرنے کا بیڑا راجہ غضنفر علی خان، پیر تاج الدین اور میاں محمد شفیع نے اُٹھایا تھا۔ نئی اصلاحات کے تحت ۱۹۳۷ء کے انتخابات کے لئے حضرت علامہ نے درخواستیں طلب کیں۔ صرف آٹھ اُمیدواروں نے درخواستیں دیں جن میں سے پارلیمانی بورڈ نے صرف سات کو پذیرائی بخشی اور انتخابات میں صرف دو اُمیدوار منتخب ہو سکے یعنی ملک برکت علی اور راجہ غضنفر علی خان۔ جن اُمیدواروں کی درخواستیں بورڈ کو موصول ہوئی تھیں اُن کے نام یہ ہیں:۔

ملک برکت علی۔ خلیفہ شجاع الدین۔ راجہ غضنفر علی خان۔ سردار کریم بخش حیدری ملک زمان مہدی خان۔ میاں عبدالمجید، مشتاق علی خاں اور مظفر علی خاں قزلباش

یہ صورت حال بڑی ہی افسوسناک تھی لیکن محمد علی جناحؒ قطعاً مایوس نہ تھے اور

جب پنجاب لیگ کے سیکرٹری نے انتخابات کے نتائج سے ان کو آگاہ کیا تو اُنہوں نے لکھا:۔

"مجھے آپ کا خط موصول ہُوا۔ پنجاب میں حالات کی مفصل صورت حال سے آگاہ کرنے پر شکریہ۔ مجھے سر محمد اقبال کا بھی خط موصول ہُوا اور میں نے اس کا جواب دیدیا ہے۔ میں اپنے خط کی ایک نقل بھیج رہا ہوں۔ میں آپ کی جرأت مندانہ اور دلیرانہ کوششوں کی تعریف کرتا ہوں۔ آپ کو ناکامی کے متعلق فکرمند نہیں ہونا چاہیئے۔ ہمارے معاملہ میں پنجاب میں ناکامی فی الواقعہ ظفرمندی ہے۔ یہی کافی ہے کہ آپ نے پنجاب میں مسلم لیگ کا پرچم لہرا دیا ہے آپ کو اس سے پریشان نہ ہونا چاہیئے کہ ہم کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ کوئی بھی ذی فہم انسان پانچ ماہ کی مختصر مدت میں فتح مندی کا دعویٰ نہیں کر سکتا اور ہمیں اس کارِ عظیم کا بیڑا اٹھانا ہے۔"

ان مایوس کن نتائج کے باوجود حضرت علامہ نے اپنی تنظیمی کار کو جاری رکھا۔ انتخاب سے قبل سردار احمد بخش خاں نے غلام رسول خاں کے ذریعہ حضرت علامہ کو آمادہ کرنے کی کوشش کی تھی کہ وہ پارلیمانی بورڈ کے دو اراکین کو نامزد کریں تو سر سکندر حیات اس پوزیشن میں ہیں کہ وہ ان اراکین کو بلا مقابلہ پنجاب اسمبلی میں بھجوائیں۔ حضرت علامہ نے اس "پیش کش" کو مسترد کر دیا کیونکہ اُن کے نزدیک مسلم لیگ ایک عوامی تحریک بننا چاہتی تھی اور سیاسی بیداری پیدا کرنا اس کا مقصد تھا۔

ان انتخابات میں ڈاکٹر سیف الدین کچلو کو امرتسر شہر سے کھڑا کرنے میں حضرت علامہ کا بڑا ہاتھ تھا۔ کانگرس کے ٹکٹ پر اُن کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ مسلم لیگ کے ٹکٹ پر وہ کھڑے ہونا نہیں چاہتے تھے۔ علامہ مرحوم نے ایک درمیانی راستہ تلاش کیا اور انہیں آزاد اُمیدوار کھڑا ہونے پر رضامند کر لیا ۱۹۲۶ء کے پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے انتخابات میں ڈاکٹر کچلو نے علامہ مرحوم کی دل کھول کر امداد کی تھی اور ٹکسالی دروازے کے اندر انتخابی جلسے کے لئے ڈاکٹر کچلو کو بطور خاص امرتسر سے صدارت کے لئے بُلایا گیا اور انہوں نے حضرت علامہ کی حمایت میں ایک زوردار تقریر کی[۱]

---

[۱]: "چند یادیں، چند تاثرات" صفہ عاشق حسین بٹالوی۔ آئینہ ادب لاہور ۱۹۶۹ء

حضرت علامہ یہ چاہتے تھے کہ مسلم لیگ کے ہاتھ زیادہ سے زیادہ مضبوط کئے جائیں۔ اُنہوں نے علالت، گھریلو ذمہ داریوں اور کمزور بینائی کے باوجود شبانہ روز محنت کی۔ اپنے ۲۰ مارچ ۱۹۳۷ء کے مراسلہ میں اُنہوں نے محمد علی جناح کو لکھا:[1]

مائی ڈیئر جناح!

اُمید ہے آپ نے پنڈت جواہر لال نہرو کا وہ خطبہ جو انہوں نے آل انڈیا نیشنل کنونشن میں دیا ملاحظہ کیا ہوگا اور اس خطبہ میں جو چیز کارفرما نظر آتی ہے وہ بھی آپ سے پوشیدہ نہ ہوگی بالخصوص جہاں تک اس کا تعلق مسلمانانِ ہند سے ہے ہندوستان اور تمام اسلامی ایشیاء کی مستقبل کی ترقی کو پیش نظر رکھتے ہوئے میں سمجھتا ہوں آپ کو اس امر کا بخوبی اندازہ ہوگا کہ نئے آئین نے کم از کم یہ تو ضرور کیا ہے کہ مسلمانوں کو اپنی تنظیمِ نو کے زبردست مواقع فراہم کر دئے ہیں۔ ویسے ہم مُلک کے دیگر ترقی پسند عناصر کے ساتھ تعاون کرنے کے لئے ہیں۔ مگر یہ بات بھی نظر انداز نہیں کرنی چاہیئے کہ مسلمانانِ ہند کی تنظیم کامل پر ہی اُن کے مقدر کا فیصلہ ہے بالخصوص ایشیا میں ایک سیاسی قوت کی حیثیت سے، اس لئے میں تجویز کرتا ہوں کہ آل انڈیا نیشنل کنونشن کو ایک معقول جواب ضرور دیا جائے۔ آپ دہلی میں بہت جلد ایک آل انڈیا مسلم کنونشن طلب فرمائیں جس میں آپ تمام صوبائی اسمبلیوں کے نئے ممبر اور دیگر ممتاز مسلمان لیڈروں کو مدعو کریں۔ اس کنونشن میں آپ پوری قوت سے اور بالکل واشگاف طریقے پر بتائیے کہ اسلامیان ہند ملک میں ایک علیحدہ سیاسی وجود رکھتے ہیں۔ ہندوستان کے اندر اور ہندوستان کے باہر بھی لوگوں کو یہ بتانے کی بڑی سخت ضرورت ہے کہ ہندوستان میں اقتصادی مسئلہ ہی نہیں اور بہت سے مسئلے ہیں کیونکہ جہاں تک مسلمانانِ ہند کا تعلق ہے وہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے لئے ہمارے تہذیبی ورثہ کا مسئلہ بھی بہت اہم ہے بلکہ اقتصادی مسئلے سے کچھ کم اہم نہیں ہے۔ اگر آپ نے یہ کنونشن بُلا لیا تو پھر ایسے مسلم اراکین اسمبلی کی نیت کا بھی اس سے پتہ چل جائے گا۔ جنہوں نے مسلمانانِ ہند کی اُمنگوں اور مقاصد کے خلاف اپنی اپنی

---

[1] اقبال کے خطوط جناح کے نام (شیخ محمد اشرف لاہور)

پارٹیاں بنا رکھی ہیں ۔ علاوہ ازیں اس بات سے ہندوؤں کو یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ خواہ کیسا ہی عیّارانہ سیاسی حربہ استعمال کیوں نہ کیا جائے، مسلمانانِ ہند اپنے ثقافتی وجود سے کبھی نظریں نہیں پھیر سکتے ۔ میں چند روز میں دہلی آ رہا ہوں اور اس اہم موضوع پر آپ سے باتیں ہو سکیں گی ۔ میں افغانی سفارت خانے میں ٹھہروں گا، اگر آپ ملاقات کے لئے کچھ وقت نکال سکیں تو ہم لوگ وہاں ملاقاتی ہوں ۔ ازراہِ کرم اس خط کے جواب میں چند لفظ جلد از جلد تحریر کریں ۔

آپ کا مخلص

اقبال

مکرّر: معاف فرمائیے گا، میں نے یہ خط ایک دوست کے ہاتھ سے لکھوایا ہے کیونکہ میری بینائی برابر خراب ہوتی جا رہی ہے ۔"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ خط کسی وجہ سے محمد علی جناح تک نہ پہنچ سکا تو حضرت علامہ نے ۲۲ر اپریل کو ایک اور مراسلہ ان کو روانہ کیا[1]

مائی ڈیئر جناح !

کوئی دو ہفتے ہوئے ہیں نے ایک خط آپ کو روانہ کیا تھا، معلوم نہیں وہ آپ کو ملا یا نہیں ۔ میں نے یہ خط آپ کو نئی دہلی کے پتہ پر لکھا تھا اور پھر بعد میں دہلی گیا بھی ۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ آپ دہلی سے پہلے ہی روانہ ہو چکے ہیں ۔ میں نے اس خط میں لکھا تھا کہ ہمیں ایک کل ہند مسلم کنونشن طلب کرنی چاہیئے ۔ مثلاً دہلی میں اور ایک بار پھر حکومت اور ہندوؤں کو بتا دینا چاہیئے کہ اسلامیانِ ہند کی سیاسی پالیسی کیا ہے ۔

چونکہ صورتِ حال سنجیدہ تر ہوتی جا رہی ہے اور پنجاب میں مسلمانوں کے جذبات تیزی سے کانگرس کی طرف مائل ہوتے جا رہے ہیں اور اس کے وجوہ کی تفصیل یہاں بتانا غیر ضروری ہے ۔ اس لئے میں عرض کروں گا کہ آپ اس معاملہ پر جس قدر ممکن ہو، غور فرما کر کوئی فیصلہ کریں ۔

---

[1] :- اقبال کے خطوط جناح کے نام (شیخ محمد اشرف لاہور)

آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس اگست تک، کے لئے ملتوی ہو چکا ہے لیکن حالات اسلامی پالیسی کے فوری اعلان مکرّر کے مقتضی ہیں اگر کنونشن سے قبل ممتاز مسلم قائدین ملک کا دورہ کرلیں تو یقین ہے کہ کنونشن نہایت کامیاب رہے گا۔ ازراہِ کرم اس خط کا جواب جس قدر جلد ممکن ہو عنایت فرمائیں۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال

حضرت علاّمہ نے اپنے ۲۸ مئی کے مراسلے میں محمد علی جناح کو لکھا:۔[1]

ڈیئر مسٹر جناح!

آپ کے عنایت نامے کا شکریہ، جو مجھے اس اثنا میں مل گیا۔ دستور کی تبدیلیوں اور لیگ کے پروگرام کے سلسلے میں میں نے جو کچھ لکھا تھا اسے آپ ذہن میں رکھیں گے۔ یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی۔ مسلمانانِ ہند کے لئے اس وقت جو سنجیدہ صورتِ حال پیدا ہو چکی ہے، مجھے یقین ہے کہ وہ آپ کی نظر سے اوجھل نہ ہوگی۔ لیگ کو حتماً یہ بات طے کرنا ہوگی کہ اسے ایک ایسی جماعت میں رہنا ہے جس میں صرف مسلمانوں کے اعلیٰ طبقے شامل ہوں یا مسلمان جمہور بھی اس میں شامل ہوں، جو اس وقت تک بوجوہ اس سے کوئی دلچسپی نہیں لیتے رہے، ذاتی طور پر میرا خیال یہ ہے کہ جو جماعت مسلمان جمہور کے مفاد کو بہتر بنانے کی سعی و کاوش کے لئے اپنے آپ کو وقف نہ کرے وہ کبھی بھی عام مسلمانوں کو اپنی طرف متوجہ نہ کر سکے گی۔

اب جو دستور بنا ہے اس میں اعلیٰ ملازمتیں درجہ اول کے مسلمانوں کے لڑکوں کے لئے وقف کر دی گئی ہیں اور جو چھوٹی ملازمتیں ہیں وہ وزراء کے دوستوں اور رشتہ داروں کے حوالے ہو جاتی ہیں۔ دوسرے امور میں بھی ہماری سیاسی جماعتوں نے مسلمانوں کی عمومی فلاح و بہبود کے باب میں کبھی سوچا بھی نہیں۔ روٹی کا مسئلہ روز بروز ٹیڑھا ہوتا جا رہا ہے۔

---

[1] :۔ اقبال کے خطوط جناح کے نام (شیخ محمد اشرف لاہور)

مسلمانوں میں احساس پیدا ہوتا جا رہا ہے کہ ان دو سالوں میں وہ برابر تنزل کی طرف جا رہے ہیں۔ عام احساس یہ ہے کہ اس غربت کی وجہ ہندوؤں کی سود خوری اور سرمایہ داری ہے۔ یہ تصور کہ اس کی یکساں وجہ غیر ملکی تسلط بھی ہے۔ ابھی تک عام مسلمان کے ذہن میں پوری طرح نہیں بیٹھا ہے۔ مگر یہ احساس پیدا ہو کر رہے گا۔ جواہر لال کی لادینی اشتمالیت مسلمانوں میں کبھی مقبول نہ ہو گی۔ لہٰذا سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کی غربت کا علاج کیا ہے؟ لیگ کا سارا مستقبل اس بات پر منحصر ہے کہ وہ کس حد تک مسلمانوں کے اس مسئلے کا حل نکالتی ہے اگر لیگ کی طرف سے کوئی امید افزا اقدام اس سلسلے میں نہ کیا گیا تو مجھے اندیشہ ہے کہ مسلمان اس سے اسی طرح لاتعلق رہیں گے جیسے اب تک ہوا ہے۔ مگر خوش نصیبی کی بات ہے کہ اس کا حل شریعت اسلام کے نفاذ میں مضمر ہے جس کے ساتھ نئے تصورات کا عہد شامل ہو۔ اور ترقی کی نئی راہیں کھولی جائیں شریعت اسلام کا گہرا اور بہت وقت مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر اس قانون الٰہی کے مضمرات کو اچھی طرح سمجھ کر اس پر صحیح عمل کیا جائے تو کم از کم معاش کا مسئلہ ضرور حل ہو جائیگا لیکن اس ملک میں ایک الگ ریاست قائم کئے بغیر اسلامی نظام کا نفاذ ہونا ناممکنات میں سے ہے۔ میرا یہ کئی سالوں تک پختہ یقین رہا ہے اور آج بھی میرا یہی یقین ہے کہ ہندوستان میں امن و عافیت کا مسئلہ اسی طرح حل ہو سکتا ہے۔ اگر ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے اس قسم کی کوئی صورت پیدا نہیں ہو سکتی تو صرف ایک راستہ باقی رہ جاتا ہے اور وہ ہے خانہ جنگی۔ اور حقیقت میں یہ خانہ جنگی ہندو مسلم فسادات کی صورت میں جاری ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ ہندوستان کے بعض حصوں مثلاً شمال مغربی حصے میں فلسطین کی داستان نہ دہرائی جائے۔ اور یہ بھی کہ جواہر لال کی اشتراکیت اگر ہندوؤں کی ہیئت سیاسہ میں سرایت کر گئی تو خود ہندوؤں میں خون خرابہ کا باعث ہو گی

برہمنیت اور اشتراکی جمہوریت میں ویسی ہی آمیزش سمجھئے جیسی برہمنیت اور بدھ مت کے درمیان ہے، کیا ہندوستان میں اشتراکیت کا وہی حشر ہوگا جو بدھ مت کا ہوا؟ اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ مگر مجھے اس بات کا قوی احساس ہے کہ اگر ہندو مت نے اشتراکیت کو قبول کر لیا تو پھر ہندو دھرم کا خاتمہ یقیناً ہو جائے گا لیکن اسلام کے لئے اشتراکی جمہوریت کی کسی معقول صورت کو قبول کر لینا (جب وہ اسلام کے اصول قوانین سے نہ ٹکرائے) کسی قسم کا انقلابی اقدام نہیں ہے بلکہ اسلام کی اصل پاکیزگی کی طرف واپس آنا ہوگا۔ لہٰذا موجودہ مسائل کا حل تلاش کرنا ہندوؤں کی نسبت مسلمانوں کے لئے کہیں زیادہ آسان ہے۔ مگر جیسا کہ میں نے بیشتر کہا ہے کہ اسلامیانِ ہند کے مسائل کے حل کے لئے یہ ضروری ہے کہ ملک کو تقسیم کر دیا جائے اور ایک یا ایک سے زیادہ ریاستیں (جہاں مسلمانوں کی متفقہ طور پر اکثریت ہو) قائم کر دی جائیں۔ کیا آپ کے خیال میں اس قسم کے مطالبے کا موقعہ نہیں آپہنچا کہ یہ مطالبہ کیا جائے میرے خیال میں یہ بہترین جواب ہے جو جواہر لال نہرو کی دہریانہ اشتراکیت کو آپ دے سکتے ہیں۔

بہر نوع، میں نے اپنے خیالات پیش کر دیئے ہیں اور اس اُمید کے ساتھ آپ ان تصورات کو اپنے خطبے میں شامل کریں گے یا لیگ کے آئندہ اجلاس کے موقع پر گفت و شنید کے دوران میں انہیں سامنے لائیں گے۔ مسلم ہند کی توقع یہ ہے کہ اس نازک وقت پر آپ کا نابغہ موجودہ مشکلات کا ضرور کوئی حل نکالے گا۔

آپ کا مخلص
محمد اقبال

مکرر:۔ "میں اس موضوع پر آپ کے نام ایک طویل اخباری خط میں شرح و تفصیل کے ساتھ گفتگو کرنا چاہتا تھا مگر بعد میں پھر خیال آیا کہ ابھی ایسے اقدام کا وقت نہیں آیا"

حضرت علامہ نے اپنے ۲۱ جون ۱۹۳۷ء کے مراسلے میں محمد علی جناح کو جو کچھ لکھا

تین سال بعد اُنہوں نے اجلاس لاہور میں اُن فرمودات کو تقریر کا جامہ پہنایا۔ حضرت علامہ نے فرمایا تھا:۔

مائی ڈیئر جناح!

نوازش نامہ کل موصول ہوا جس کے لئے سراپا سپاس ہوں۔ آپ کی بے پناہ مصروفیات سے باخبر ہونے کے باوجود آپ کو اکثر لکھتے رہنے کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ اس وقت مسلمان اس طوفان میں جو شمال مغربی ہندوستان اور شاید مُلک کے گوشے گوشے سے اُٹھنے والا ہے اس بھنور سے حفاظت کے ساتھ مسلمانوں کی کشتی نکالنے کا کام، اگر کوئی مسلمان قائد اس وقت کرسکتا ہے تو وہ آپ کی ذات ہے اور مسلمانوں کو بحیثیت قوم اس باب میں آپ کی طرف اُمید کی نظر سے دیکھنے کا حق ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہم عملاً خانہ جنگی میں مبتلا ہیں اور اگر پولیس اور فوج نہ ہو تو اس خانہ جنگی کو عام ہوتے کچھ دیر نہ لگے۔ گذشتہ چند ماہ میں کتنے ہندو مسلم فسادات برپا ہو چکے ہیں۔ صرف شمال مغربی ہندوستان میں ان تین ماہ میں کم از کم تین فرقہ وارانہ فسادات ہو چکے ہیں۔ اور حضور اکرمؐ کی ہندوؤں اور سکھوں نے کوئی چار مرتبہ اہانت کی۔ ان چاروں موقعوں پر ہائے رسولؐ کو فی النار کر دیا گیا۔ سندھ میں قرآن کریم کو نذرِ آتش کرنے تک کے واقعات ہوئے ہیں۔ ان تمام واقعات کی اچھی طرح چھان بین کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ان واقعات کے اسباب نہ مذہبی ہیں، نہ معاشی بلکہ خالصتاً سیاسی ہیں۔"

حالات کا تجزیہ کرنے کے بعد حضرت علامہ نے مزید لکھا:۔

"مسلمانوں کی اکثریت کے صوبوں میں بھی ہندوؤں اور سکھوں کا اصلی مقصد صرف یہ ہے کہ صرف مسلمانوں پر خوف و ہراس طاری ہو جائے اور نیا دستور کچھ اس قسم ہے کہ مسلم اکثریت کے صوبوں میں بھی مسلمانوں کا دار و مدار غیر مسلموں

• :۔ اقبال کے خطوط جناح کے نام (شیخ محمد اشرف لاہور)

پر ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ مسلم وزارت نہ صرف یہ کہ مناسب کارروائی نہیں کر سکتی بلکہ وزارت کو خود مسلمانوں سے ناانصافی برتنی پڑتی ہے تاکہ وہ لوگ جن کی حمایت کی وجہ سے وزارت قائم ہے، خوش رہیں اور ساتھ ہی دوسروں پر یہ ظاہر بھی کیا جا سکے کہ وزارت قطعی طور پر غیر متعصب ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم کچھ مخصوص وجوہات کی بنا پر اس دستور کو رد کر رہے ہیں۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نیا دستور ہندوؤں کو خوش کرنے کے لئے ہی بنایا گیا ہے۔ ہندو اکثریت کے صوبوں میں تو ہندوؤں کو قطعی اکثریت حاصل ہے اور وہ مسلمانوں کو بالکل نظر انداز کر کے حکومت کر سکتے ہیں۔ مگر مسلم اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں کو ہندوؤں کا دستِ نگر رکھا گیا ہے۔ میرے ذہن میں ذرا بھی شک نہیں کہ موجودہ دستور ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے زہر قاتل کا حکم رکھتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ اقتصادی مسئلہ کا بھی حل نہیں ہے جو مسلمانوں کے لئے اس قدر جانکاہ بن چکا ہے، فرقہ وارانہ مسئلہ کا جو برطانوی فیصلہ کیا گیا ہے وہ بس اتنا کرتا ہے کہ ہندوستان میں ان کے سیاسی وجود کو تسلیم کر لیا گیا ہے لیکن کسی قوم کی سیاسی ہستی کا ایسا اعتراف جو اس کی معاشی پسماندگی کا کوئی حل تجویز نہ کرتا ہو اور نہ کر سکے، اس کے لئے بے سود ہے کانگرس کے صدر نے تو غیر مبہم الفاظ میں مسلمانوں کی جداگانہ سیاسی حیثیت سے ہی انکار کر دیا ہے ہندوؤں کی دوسری سیاسی جماعت یعنی ہندو مہاسبھا نے اور میرے خیال میں یہی ہندوؤں کی اصل نمائندہ جماعت ہے۔ اس نے بار بار اعلان کیا ہے کہ ہندو اور مسلمان کی متحدہ قومیت کا وجود ہندوستان میں ناقابلِ قبول ہے۔

ہندوستان میں قیام امن اور مسلمانوں کو غیر مسلموں کے قبضہ و تسلط سے بچانے کی واحد ترکیب اس طریق پر ہے جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے مسلم صوبوں کے ایک جداگانہ وفاق میں اسلامی اصلاحات کا نفاذ ہے ملک کی از سرِ نو تقسیم کی جائے جس کی بنیاد نسلی، مذہبی اور لسانی اشتراک ہو

بہت سے انگریز مدبرین بھی کچھ ایسا ہی محسوس کر رہے ہیں اور اس آئین کے جلو میں جو ہندو مسلم فسادات چلے آرہے ہیں وہ ان کی آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہیں کہ ملک ہند میں اس وقت حقیقتاً کیا کیفیت پیدا ہو چکی ہے۔ میں جب انگلستان سے روانہ ہوا تو لارڈ لوتھین نے مجھ سے یہی کہا تھا کہ ہندوستان کے مصائب کا ممکن حل یہی ہے کہ اسے تقسیم کیا جائے یعنی وہ میری اسکیم کے حق میں تھے مگر اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ۲۵ برس لگ سکتے ہیں۔ پنجاب کے بعض مسلمان یہ تجویز بھی پیش کر رہے ہیں کہ شمالی مغربی ہند کے مسلمانوں کی ایک کانفرنس طلب کی جائے اور اب اس خیال کی تائید بڑی تیزی سے ہو رہی ہے۔ مجھے آپ کے اس خیال سے اتفاق ہے کہ ہماری قوم ابھی اتنی کافی منظم نہیں ہوئی ہے اور نہ ان میں اتنا نظم وضبط ہے کہ اس پر عمل ہو مزید یہ کہ ابھی اس قسم کی کانفرنس منعقد کرنے کا صحیح وقت نہیں آیا ہے۔ مگر میرا احساس یہ ہے کہ اگر اپنے خطبے میں اس بات کی طرف اشارہ کر دیں تو بڑا اچھا ہو کہ دنیا کو یہ معلوم ہو سکے گا کہ یہ ہیں وہ خطوط جن کی طرف شمال مغربی سرحدی صوبے کے مسلمان بالآخر قدم اٹھانے پر مجبور ہونگے

میرے خیال میں یہ نیا آئین کہ پورے ہندوستان کا ایک وفاق قائم کیا جائے قطعاً فضول ہے، میں نے جن خطوط پر اپنی تجاویز پیش کی ہیں ان ہی سے اس بات کا حل نکلتا ہے کہ ہندوستان میں امن وعافیت کی راہ نکلے اور مسلمانوں کو غیر مسلموں کے تسلط سے چھٹکارا ملے۔ کیا وجہ ہے کہ شمال مغربی سرحدی ہندوستان اور بنگال کے مسلمانوں کو علیحدہ اقوام متصور نہیں کیا جائے جنہیں حق خود اختیاری حاصل ہو۔ اسی طرح خود ہندوستان کی اقوام کو یا بیرون ہند لوگوں کو حاصل ہے۔

میری ذاتی رائے تو یہ ہے کہ شمال مغربی ہند اور بنگال کے مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ فی الوقت ہندوستان کے مسلم اقلیتی صوبوں کو نظر انداز کر دیں یہ بات مسلم اکثریتی اور مسلم اقلیتی دونوں ہی وضع کے صوبوں کے مسلمانوں

کے حق میں بہتر طریقہ ہے۔ اس لئے میرا خیال یہ ہے کہ لیگ کا آئندہ اجلاس آپ پنجاب میں طلب کریں اور کسی مسلم اقلیتی صوبے میں نہیں لاہور میں اگست کا مہینہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔ میرے خیال میں آپ کو لاہور میں وسط اکتوبر میں جب موسم خوشگوار ہو جاتا ہے لیگ کے اجلاس کے انعقاد کے امکان پر غور کرنا چاہیئے۔

پنجاب میں آل انڈیا مسلم لیگ سے دلچسپی بڑی تیزی سے بڑھ رہی ہے اور لیگ کا آئندہ اجلاس کا لاہور میں انعقاد پنجابی مسلمانوں کی سیاسی بیداری کے لئے ازحد مفید ہوگا۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال

حضرت علاّمہ کو فلسطین کے مسلمانوں کے ساتھ بے حد اُنس تھا۔ ۲۶ جولائی ۱۹۳۷ء کو اُن کے ایماء پر موچی دروازے کے باغ میں مسلم لیگ کا ایک جلسۂ عام منعقد کیا گیا۔ اس کی صدارت ملک برکت علی نے کی۔ مسلم لیگ کا یہ جلسہ نہایت ہی کامیاب تھا۔ اس جلسے میں برطانوی حکومت کے مقرر کردہ کمیشن کی فلسطین کو تقسیم کرنے کی تجویز کی زبردست مخالفت کی گئی اور برطانوی حکومت کے رویّے کی مذمت میں قرارداد منظور کی گئی۔ غلام رسول خان نے حضرت علاّمہ کے ایک بیان کا اردو ترجمہ پڑھ کر سنایا جس میں آپ نے فرمایا تھا کہ [1]

"میں آپ لوگوں کو اس امر کا یقین دلاتا ہوں کہ عربوں کے ساتھ جو ناانصافی کی گئی ہے میں اُس کو اسی شدت سے محسوس کرتا ہوں جس شدت سے ہر وہ شخص اُسے محسوس کرتا ہے جسے مشرقِ قریب کے حالات کا تھوڑا بہت علم ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ابھی پانی سر سے نہیں گزرنے پایا۔ اور انگریز قوم کو بیدار کر کے جو اُس نے انگلستان کے نام پر عربوں کے ساتھ کئے تھے۔

[1]:- اقبال کے آخری دو سال ص ۴۳۱ - ۴۳۶

بہر حال یہ امر کسی حد تک موجبِ اطمینان ہے کہ برطانوی پارلیمنٹ میں اس موضوع پر جو بحث ہوئی ہے اُس میں تقسیم فلسطین کے مسئلے کا کوئی دوٹوک فیصلہ نہیں کیا گیا۔ لہٰذا اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر مسلمانانِ عالم کو چاہیئے کہ پوری بلند آہنگی کے ساتھ اعلان کریں کہ برطانیہ کے مدبّرین جس عقدے کا حل تلاش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اس کا تعلق صرف فلسطین تک محدود نہیں بلکہ وہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک پورے عالمِ اسلام کو بُری طرح متاثر کر رہا ہے۔

"اگر تاریخی پس منظر کو سامنے رکھ کر اس کا مطالعہ کیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ یہ معاملہ خالصتہً اور کلیتہً مسلمانوں کا معاملہ ہے۔ تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، بیت المقدس تشریف لے گئے تھے۔ اور اس واقعہ پر بھی آج تیرہ سو برس کا عرصہ گذر چکا ہے۔ تو اُن کی تشریف آوری سے مدتوں پہلے یہودیوں کا فلسطین کے ساتھ کوئی تعلق باقی نہیں رہا تھا۔ یہودیوں کو فلسطین سے زبردستی نہیں نکالا گیا تھا بلکہ جیسا کہ پروفیسر ہاکنگز کی رائے ہے وہ اپنی خوشی سے دوسرے ممالک میں چلے گئے تھے اور اُن کے صحف مقدس کا بیشتر حصہ بھی فلسطین سے باہر ہی قلمبند کیا گیا تھا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ فلسطین کا سوال کبھی مسیحیوں کا مسئلہ نہیں بنا تھا۔ دورِ حاضر کی تاریخی تحقیقات کی روشنی میں تو راہب پیٹر کا وجود بھی مشتبہ اور غیر یقینی نظر آنے لگا تھا۔ اگر بفرضِ محال یہ مان بھی لیا جائے کہ صلیبی جنگوں کی غرض و غایت یہ تھی کہ فلسطین کو مسیحی مسئلہ بنایا جائے۔ تو پھر یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ صلاح الدین کی فتوحات نے ایسی تمام کوششوں کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا تھا۔ لہٰذا میری نگاہ میں فلسطین کا مسئلہ سراسر اور کلیتہً مسلمانوں کا مسئلہ ہے۔"

"مشرقِ قریب کے مسلمانوں کے بارے میں برطانوی شہنشاہیت کے مذموم ارادوں کو جس بُری طرح رائل کمیشن نے اس رپورٹ میں بے نقاب کیا ہے اس کی مثال

پہلے کبھی نظر نہیں آئی فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنانے کی تجویز تو محض ایک بہانہ ہے۔ اصلیّت یہ ہے کہ مسلمانوں کی اس مقدس اور مذہبی سرزمین پر اپنا مستقل انتداب قائم رکھ کر برطانوی شہنشاہیت خود اپنے لئے ایک نیا ٹھکانہ پیدا کر رہی ہے۔ یہ اقدام ایک خطرناک تجربہ ہے اور برطانوی پارلیمنٹ کے ایک رُکن نے بھی اس کو خطرناک تجربے ہی سے تعبیر کیا ہے۔"

"بحرِ روم میں برطانیہ کو جو مشکلات درپیش ہیں یہ تجربہ اُن کو رفع نہیں کر سکے گا بلکہ یوں کہنا زیادہ صحیح ہے کہ اُن مشکلات کو رفع کرنے کی بجائے یہ تجویز برطانوی شہنشاہیت کے لئے بہت سے نئے مصائب کا پیش خیمہ ثابت ہوگی۔"

"عربوں کو جس جس طریقے سے تنگ کر کے اپنی ارضِ مقدس، جس پر مسجد عمر رضؓ قائم ہے فروخت کرنے پر مجبور کیا گیا ہے۔ اُس میں ایک طرف تو مارشل لاء جاری کر دینے کی سخت دھمکیاں ہیں اور دوسری طرف عربوں کو قومی فیاضی اور اُن کی روایتی مہمان نوازی کے جذبابِ لطیف کو برانگیختہ کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔ یہ طرزِ عمل گواس بات کا ثبوت ہے کہ برطانوی تدبّر کا اب دیوالیہ نکل چکا ہے۔ یہودیوں کو زرخیز اراضی کی پیش کش کر کے اور عربوں کو پتھریلی بنجر زمین کے ساتھ کچھ نقد رقم دیکر راضی کرنے کی کوشش قطعاً کسی سیاسی ہوش مندی کا ثبوت نہیں ہے۔ یہ تو ایک ادنیٰ درجے کی حقیر سودے بازی ہے جو یقیناً اس عظیم الشان قوم کے لئے موجبِ ننگ اور باعثِ شرم ہے جس کے نام پر عربوں سے آزادی کا وعدہ کیا گیا تھا اور یہ وعدہ بھی کیا گیا تھا کہ اُن کے درمیان ایک مشترکہ و متحدہ وفاق قائم کر دیا جائیگا"

"میں اس مختصر سے بیان میں رائل کمیشن کی رپورٹ کے تمام پہلوؤں پر تفصیلی بحث کرنے سے معذور ہوں۔ تاہم یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اسلامی ایشیا کو زمانہ حال کی تاریخ سے بعض بے حد اہم سبق ضرور سیکھنا چاہئیں۔ تجربے نے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح کر دی ہے کہ مشرق قریب کے لوگوں کی سیاسی زندگی کی بقا صرف اس راز میں مضمر ہے کہ ترکوں اور عربوں کا اتحاد جلد از جلد قائم ہو جانا چاہیئے مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ترکوں کو عالم اسلام سے جُدا کرنے کی سازشیں بدستور جاری ہیں۔ گاہے گاہے اس قسم کی خبریں بھی سُننے میں آجاتی ہیں کہ ترک اسلام سے

منحرف ہو رہے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس سے بڑا جھوٹ شاید ہی کبھی بولا گیا ہو گا۔ اس نوع کے شرارت انگیز اور فتنہ پرور پروپیگنڈے کا شکار بالعموم وہی لوگ ہوتے ہیں جنہوں نے اسلامی فقہ اور اسلامی اُصول قانون کے افکار کی تاریخ کا مطالعہ نہیں کیا۔"

"یہ عرب ہی تھے جن کے مذہبی شعور نے اسلام کو جنم دیا تھا جس نے آگے چل کر ایشیا کی مختلف قوموں کو متحد و مربوط کرنے میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی تھی اس لئے عربوں کو چاہیئے کہ اُن نتائج کو ہرگز فراموش نہ کریں، جو محض اس وجہ سے پیدا ہوئے تھے کہ انہوں نے ابتلاء اور مصیبت کے وقت ترکوں کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

"دوسرا سبق یاد رکھنے کے قابل یہ ہے کہ عربوں کو چاہیئے کہ اپنے قومی مسائل پر غور و فکر کرتے وقت عرب ممالک کے بادشاہوں کے مشوروں پر اعتماد نہ کریں۔ کیونکہ بحالاتِ موجودہ ان بادشاہوں کی حیثیت ہرگز اس قابل نہیں کہ وہ محض اپنے ضمیر و ایمان کی روشنی میں فلسطین کے متعلق کسی صحیح فیصلے یا کسی صائب نتیجے پر پہنچ سکیں۔"

تیسرا سبق یہ ہے کہ آج فلسطین کے بارے میں ایشیا کے تمام آزاد اسلامی ممالک کی حمیّت و غیرت کا امتحان ہے۔ خواہ وہ ممالک عرب ہیں یا غیر عرب — منصبِ خلافت کی تنسیخ کے بعد عالم اسلام کے لئے یہ پہلا بین الاقوامی مسئلہ ہے جس کی نوعیت بیک وقت مذہبی اور سیاسی ہے اور جس سے نبرد آزما ہونے کے لئے زمانے کی طاقتیں اور تاریخ کے تقاضے آزاد اسلامی ممالک کو پکار رہے ہیں۔"

"یہ بہت ممکن ہے کہ یہی مسئلہ آگے چل کر ایشیا کے آزاد اسلامی ممالک کو اس اینگلو فرانسیسی ادارے سے جسے غلطی سے جمعیّت اقوام کا نام دے دیا گیا ہے، اس قدر بدگمان و برگشتہ کر دے کہ وہ اپنے تحفظ کے لئے اقوام مشرق کی ایک علیحدہ جمعیت قائم کرنے کے امکانات پر غور کرنے کے لئے مجبور ہو جائیں۔

حضرت علامہ کا مندرجہ بالا بیان نیو ٹائمز میں شائع ہوا تھا۔

حضرت علامہؒ نے ۱۱ر اگست کو محمد علی جناح کو لیگ کے اجلاس کے متعلق درج ذیل مراسلہ بھیجا[1]

مائی ڈیئر مسٹر جناح!

حالات نے اب یہ بات بالکل واشگاف طور پر ثابت کر دی ہے کہ لیگ کو تمام تر توجہ مسلمانان شمال مغربی ہند پر مرکوز کر دینی چاہیئے۔ لیگ کے دفتر دہلی نے غلام رسول صاحب کو مطلع کیا ہے کہ مسلم لیگ کے اجلاس کی تاریخیں ابھی طے نہیں ہوئی ہیں۔

ایسی حالات میں اندیشہ ہے کہ لیگ کا اجلاس اگست اور ستمبر میں نہیں ہو سکے گا۔ بدیں وجہ میں اپنی گذارش پھر دہراتا ہوں کہ لیگ کا اجلاس لاہور میں وسط یا آواخر اکتوبر میں طلب کیا جائے۔ پنجاب میں لیگ کے لئے جوش برابر بڑھ رہا ہے اور میرا پختہ یقین ہے کہ لیگ کا اجلاس اگر لاہور میں منعقد ہوا تو یہ لیگ کی تاریخ میں ایک نقطہ انقلاب ثابت ہوگا اور عوام سے رابطہ اُستوار کرنے کا بہت عمدہ قدم ہوگا۔ ازراہِ کرم جواب میں چند سطریں لکھیئے۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال

پنجاب مسلم لیگ کے صدر علامہ اقبال اور سیکرٹری غلام رسول خاں بیرسٹر ایٹ لاء تھے لیکن اس میں فعّال حیثیت ملک برکت علی کو حاصل تھی کیونکہ حضرت علامہ خرابیٔ صحت کی بنا پر سرگرم کردار ادا نہ کر سکتے تھے۔ لیکن ملک برکت علی حضرت علامہ سے مشورہ لے کر ہی کوئی اقدام کرتے۔ اپنے ۷ر اکتوبر کے مراسلے میں حضرت علامہ نے محمد علی جناح کو لکھا:[2]

مائی ڈیئر مسٹر جناح!

لیگ کے اجلاس لکھنؤ میں پنجاب کا ایک مضبوط گروہ شریک ہوگا

---

[1] :- اقبال کے خطوط جناح کے نام (شیخ محمد اشرف لاہور)

سر سکندر حیات کی قیادت میں یونینسٹ مسلمانوں کی بھی کافی تعداد شرکت کی تیاری کر رہی ہے۔ آج کل ہم بڑی مشکلات میں گھرے ہوئے ہیں اور ہندوستانی مسلمانوں کی توقع یہ ہے کہ آپ اپنے خطبے میں نہایت واضح الفاظ میں مسلمانوں کی رہنمائی کے لئے ہدایت دیں گے جو ان کے جملہ امور پر محیط ہو۔ لیگ کو چاہیئے کہ وہ ایک موزوں تحریک کی شکل میں فرقہ وارانہ مسئلے کے فیصلے کی بابت اپنی پالیسی کا اعلان یا مکرّر وضاحت ضرور کرے۔ میں نے سُنا ہے کہ پنجاب اور سندھ میں بھی بعض گمراہ مسلمان اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ ہندوؤں کو خوش کرنے کے لئے اس میں کچھ ترامیم کرائیں۔ یہ لوگ شاید اس بھلاوے میں پھنسے ہوئے ہیں کہ اس طرح وہ اپنا اقتدار قائم رکھ سکیں گے۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ انگریزی حکومت ہندوؤں کو اعزاز بخشنے کی فکر میں ہے جو فرقہ وارانہ فیصلے میں گڑبڑ کرانے کو خوش آمدید کہیں گے اور اس غرض سے انگریزی راج اس کوشش میں لگا ہوا ہے کہ اپنے مسلم ایجنٹوں کے ذریعے اس میں گڑبڑ کرے۔

"لیگ کونسل کی خالی نشستوں کے لئے میں نے اٹھائیس آدمیوں کی فہرست تیار کی ہے جو جناب غلام رسول آپ کو دکھائیں گے۔ مجھے توقع ہے کہ انتخاب بہت سوچ بچار کے بعد ہی کیا جائے گا۔ ہمارے آدمی ۱۳ تاریخ کو لاہور سے روانہ ہوں گے۔"

یاد رہے کہ ۸ جون ۱۹۳۶ء کے آل انڈیا مسلم لیگ کونسل اور مرکزی پارلیمانی بورڈ کے اجلاس منعقدہ لاہور میں یونینسٹ پارٹی نے برملا لیگ کی مخالفت کی تھی۔ حضرت علامہ نے لیگی اراکین کے اخراج کا مطالبہ کیا تھا جو دونوں جماعتوں کے رُکن تھے۔ لیکن محمد علی جناح نے بعض مصلحتوں کی بنا پر ایسا نہ کیا۔ حالانکہ ۱۱ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو دہلی دروازہ لاہور کے جلسہ میں محمد علی جناح نے اپنی تقریر میں سر سکندر حیات کو ان الفاظ میں چیلنج کیا تھا:۔

"کیا میں سر سکندر حیات خاں سے پوچھ سکتا ہوں کہ اگر وہ اہلِ پنجاب کی غیر فرقہ وارانہ بُنیادوں پر خدمت کرنے کے لئے اس قدر بے تاب تھے تو آج سے پہلے کہاں تھے؟ کیا انہوں نے ریزرو بینک کی ملازمت اسی خواب کو شرمندہ تعبیر کرنے کے لئے قبول کی تھی؟ اس بلند مقصد کی تکمیل کے لئے انہوں نے اس سے پہلے کیوں استعفیٰ نہ دیا؟ میں پوچھتا ہوں کہ نواب مظفر خاں کی جگہ سر سکندر حیات خاں کو قلمدان وزارت سنبھالنے کی ضرورت کیوں لاحق ہوئی؟ ان سوالوں کا جواب سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ یہ تمام ردّ و بدل صرف اس لئے ہو رہا ہے کہ یونینسٹ پارٹی کے ارکان میں وزارتیں اور عُہدے تقسیم ہوتے رہیں۔ یہ پارٹی جو خود غرض اور طالع آزما افراد پر مشتمل ہے اور جس کو حکومتِ پنجاب کی سرپرستی اور امداد بھی حاصل ہے، یقیناً اس قابل ہے کہ اس کی جی کھول کر مذمت کی جائے۔"[1]

اکتوبر ۱۹۳۷ء میں لکھنؤ میں لیگ کا اجلاس منعقد ہوا۔ جو لوگ حضرت علامہ کی طرف سے نامزد کئے گئے تھے اُن میں ملک برکت علی، ملک زمان مہدی پیر تاج الدین۔ غلام رسول خاں۔ میاں عبدالمجید، عاشق حسین بٹالوی اور خلیفہ شجاع الدین ممتاز ہیں۔ یونینسٹ نمائندوں میں سر سکندر حیات خاں۔ میاں احمد یار خاں دولتانہ، نواب مظفر خاں، راجہ غضنفر علی خاں۔ میاں عبدالحی، نواب نثار علی خاں۔ میاں امیر الدین۔ نواب زادہ خورشید علی خاں، سید امجد علی، میر مقبول محمود، سید افضال علی حسن، نواب ممدوٹ، میاں غیاث الدین۔ بیگم شاہنواز۔ ملک خضر حیات ٹوانہ اور سر شیر محمد خاں قابلِ ذکر ہیں۔ اخباری نمائندوں میں سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور کے میر نور احمد شامل تھے۔ ان اصحاب کے علاوہ پنجاب سے مولانا ظفر علی خاں۔ ملک لال دین قیصر۔ حاجی امین الدین صحرائی۔ میاں فیروز الدین احمد، میاں بشیر احمد اور حمید نظامی بھی اجلاس میں شریک ہوئے۔ حضرت علامہ خرابیٔ صحت کی بنا پر تشریف نہ لے جا سکے۔

---

[1]:۔ اقبال کے آخری دو سال ص ۳۶۱ و ۳۶۲

اس طرح پنجاب کی دو پارٹیاں لکھنؤ پہنچیں۔ سر سکندر حیات نے کسی نہ کسی طرح محمد علی جناح کو ایک سمجھوتہ پر آمادہ کر لیا جس کے نتیجہ میں جناح سکندر پیکٹ منصۂ شہود پر آیا۔ سول اینڈ ملٹری گزٹ کے نامہ نگار نے اس دستاویز کو اس کے نام سے تعبیر کیا اور بعد میں یہ نام ہر ایک کی نوک زبان پر تھا۔ اس پیکٹ کی رُو سے سر سکندر حیات نے اپنی جماعت سمیت لیگ میں شامل ہونے کا اعلان کیا

اس پیکٹ پر حضرت علامہ کا ردِ عمل بڑا سخت تھا لیکن ایک اچھے وفادار سپاہی کی طرح انہوں نے قائداعظم کے احکامات کی بجا آوری کی۔ حضرت علامہ یونینسٹ پارٹی کے مافی الضمیر سے اچھی طرح واقف تھے اور جانتے تھے کہ یہ لوگ کبھی دل سے مخلص نہیں ہو سکتے اور ایسا ہی ہوا۔ سر سکندر حیات اور اُن کے ہمنواؤں نے اس اعلان کی مختلف تاویلیں کرنا شروع کر دیں۔ خود سر سکندر حیات نے کہا:-

"جہاں تک پنجاب کا تعلق ہے، یہ معاہدہ مختلف جماعتوں پر اثر انداز نہیں ہوگا اور ان جماعتوں کی موجودہ حیثیت میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ البتہ یونینسٹ پارٹی کے اُن مسلمانوں، ممبروں کو جو مسلم لیگ کے ممبر نہیں ہیں، مشورہ دیا جائے گا کہ وہ لیگ کی رُکنیت بھی قبول کر لیں۔

جہاں تک عام یا ضمنی انتخابات کا تعلق ہے، اس معاہدے کا یہ نتیجہ ہوگا کہ وہ مسلمان جو مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کھڑے ہوں گے انہیں الیکشن سے پہلے اقرار کرنا پڑے گا کہ کامیاب ہونے کے بعد وہ فوراً یونینسٹ پارٹی میں شریک ہو جائیں گے اس طرح الیکشن میں اُنہیں یونینسٹ پارٹی کی مدد بھی حاصل ہوگی۔"

"ان باتوں سے صاف عیاں ہوتا ہے کہ پنجاب میں اس وقت جو جماعتیں جس جس طرح کام کر رہی ہیں اُن میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔"[۱]

اسی طرح راجہ غضنفر علی خاں اور سر چھوٹو رام نے بھی بیانات دیئے۔ اس

---

[۱] Civil and Military Gazette, Lahore, 17.10.1937.

طرح لیگ کے دفتر میں شکایات اور استفسارات کا سلسلہ شروع ہو گیا تو غلام رسول خاں اور ملک برکت علی نے اپنے بیانات میں کہا کہ پرانی یونینسٹ پارٹی، جس کے ٹکٹ پر ابھی چند ماہ بیشتر انتخابات کی جنگ لڑی گئی تھی، ختم ہو گئی ہے لیکن سر سکندر حیات اور اُن کے ہمنواؤں کا کہنا تھا کہ دونوں فریقوں کی اپنی اپنی حیثیت بدستور قائم رہے گی۔ گویا حضرت علامہ کے خدشات درست ثابت ہوئے جن کے پیشِ نظر اس کے علاوہ فرقہ وارانہ مسئلہ اور اس کی اہمیت بھی تھی۔ چنانچہ اپنے ۷ راکتوبر ہی کے مراسلے میں اُنہوں نے محمد علی جناح کو لکھا تھا:۔

"لیگ کو یہ فیصلہ کرنا چاہیئے کہ کوئی صوبہ فرقہ وارانہ فیصلے کے سلسلے میں کسی اور فرقے کے ساتھ کسی قسم کی مفاہمت کرنے کا مجاز نہ ہوگا۔ یہ ایک کُل ہند مسئلہ ہے اور اس کا فیصلہ صرف لیگ کر سکتی ہے۔ بلکہ آپ چاہیں تو اس بات کا بھی اضافہ کر سکتے ہیں، اس وقت فضا ایسی مناسب نہیں ہے کہ کسی قسم کا فرقہ وارانہ سمجھوتہ کیا جائے۔"

حضرت علامہ کے دل میں مسلمانانِ ہند کے علاوہ عالمِ اسلام کا درد بھی تھا، وہ چاہتے تھے کہ پوری دُنیا میں مسلمان آزاد و خود مختار ہوں۔ مسئلہ فلسطین پر بحث کرتے ہوئے انہوں نے ۷ راکتوبر ہی کے مراسلے میں لکھا تھا۔

"مسئلہ فلسطین مسلمانوں کو بُری طرح بے چین کر رہا ہے۔ لیگ کے مقاصد کے لئے عوام سے قریب تر آنے کا اس سے بہتر اور کیا موقع ہو سکتا ہے۔ مجھے قوی یقین ہے کہ اس سلسلے میں لیگ کی طرف سے ایک بڑی مضبوط تحریک منظور کی جائے گی اور قائدین کی ایک نجی کانفرنس بھی منعقد کی جائے، جس میں یہ فیصلہ ہو کہ وہ اقدام کیا جائے جس کے ذریعہ عوام بڑی سے بڑی تعداد میں شریک کئے جا سکیں۔ اس چیز سے لیگ فوراً مقبولیت حاصل کر لے گی اور فلسطین کے عربوں کی امداد بھی ہو جائے گی۔ ذاتی طور پر مجھے اس بات کی بھی پروا نہیں کہ جیل چلا جاؤں۔ اسلام اور ہندوستان کی خاطر مشرق کے عین دروازے پر مغرب کا اڈہ بنتا ہے تو وہ دونوں ہی کے لئے ایک خطرہ ہے۔"

اس خط کا ہر لفظ یہ ظاہر کرتا ہے کہ حضرت علامہ خارزارِ سیاست میں پھونک

پھونک کر قدم رکھنے کے عادی نہ رہے تھے۔ وہ اب سخت سے سخت اقدام کرنے پر بھی آمادہ نظر آتے تھے لیکن وہ چاہتے تھے کہ مسلمان اپنی صفوں میں نظم و ضبط پیدا کریں۔ اپنے ۳۰ ر اکتوبر کے مراسلے میں انہوں نے محمد علی جناح کو لکھا[1]:

آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے جو تحریک منظور کی ہے، اُمید ہے وہ آپ پہلے ہی پڑھ چکے ہوں گے۔ آپ نے بروقت جو قدم اُٹھایا اُس نے صورتِ حال کو بگڑنے سے بچا لیا ہے اور ہم سب کو اس بات کا انتظار ہے کہ آپ کانگرس کی قرارداد پر کیا تاثرات ظاہر کرتے ہیں۔ لاہور کے "ٹربیون" نے پہلے ہی اس پر نکتہ چینی شروع کر دی ہے اور میرا خیال ہے کہ ہندوؤں کی رائے عامہ عام طور پر اس کے خلاف ہی ہو گی۔ مگر جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے انہیں اس بات کے نشے میں نہیں رہنا چاہیئے بلکہ نظم ملت کا کام ایسے جوش اور ولولے کے ساتھ جاری رکھنا چاہیئے جو پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ اور اس وقت تک دم نہیں لینا چاہیئے جب تک پانچ صوبوں میں مسلم حکومتیں قائم نہ ہو جائیں اور بلوچستان کو اصلاحات عطا نہیں ہوتیں۔

افواہ ہے کہ یونینسٹ پارٹی کا کچھ حصہ لیگ کے سیاسی عقیدے پر دستخط کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ اب تک سر سکندر حیات اور اُن کی پارٹی کے لوگوں نے اس دستخط نہیں کئے ہیں اور آج صبح میں نے یہ بھی سُنا کہ وہ لیگ کے آئندہ اجلاس تک انتظار کرنا چاہیں گے۔ ان لوگوں میں سے ایک صاحب ہی نے مجھے بتایا کہ ان کا خیال ہے کہ اس طرح وہ صوبائی لیگ کی سرگرمیوں کو سرد کر دینا چاہتے ہیں میں حال ہی میں چند روز میں آپ کو جملہ حقائق کی تفصیل بھیج دوں گا، اور یہ رائے دوں گا کہ ہمیں کس طرح اپنا کام آگے بڑھانا چاہیئے۔ مجھے بڑی پختہ اُمید ہے کہ لیگ کے اجلاس لاہور سے قبل آپ ضرور پنجاب کا کم سے کم دو ہفتے کا دورہ کریں گے۔"

حضرت علامہ یونینسٹ پارٹی کے حربوں سے بخوبی واقف تھے اور چاہتے تھے کہ لیگ

---

[1]: اقبال کے خطوط جناح کے نام (شیخ محمد اشرف لاہور)

کو پاک ہی رکھیں۔ چنانچہ اُنہوں نے دو روز بعد یعنی یکم نومبر کو پھر ایک مُراسلہ محمد علی جناح کو بھیجا جس میں لکھا:[1]

"سر سکندر حیات اور اُن کی پارٹی کے چند لوگ کل مجھ سے ملنے آئے۔ لیگ اور یونینیسٹ پارٹی کے اختلافات کے سلسلے میں ہماری کافی طویل گفتگو ہوئی۔ دونوں فریقوں کی جانب سے اخبارات کو بیانات جاری کر دیئے گئے ہیں۔ اور جناح سکندر معاہدے کے سلسلے میں دونوں نے اپنی اپنی تاویلات بیان کی ہیں۔ اس چیز نے کافی غلط فہمیاں پیدا کر دی ہیں جیسا کہ میں نے پہلے بھی تحریر کیا تھا۔ میں یہ سارے بیانات چند یوم میں آپ کو روانہ کر دوں گا۔ فی الوقت میں درخواست کرتا ہوں کہ آپ مجھے ممکنہ عجلت کے ساتھ اس سمجھوتے کی نقل بھیج دیجئے جس پر سر سکندر نے دستخط کئے ہیں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ یہ آپ کے پاس ہے۔ میں آپ سے یہ بھی معلوم کرنے کا خواہاں ہوں کہ آپ اس بات پر رضامند ہو گئے تھے کہ صوبائی پارلیمانی بورڈ پر یونینیسٹ کا کنٹرول رہے گا۔ سر سکندر نے مجھے یہ بتایا ہے کہ آپ اس پر راضی ہو گئے ہیں۔ اس لئے وہ کہتے ہیں کہ بورڈ میں یونینیسٹ پارٹی کی اکثریت ہونی چاہیئے۔ مگر جہاں تک مجھے نظر آتا ہے جناح سکندر سمجھوتے میں کوئی ایسی بات نہیں ہے۔"

جہاں تک ممکن ہو میرے خط کا جواب جلد دیجئے۔ ہمارے آدمی صوبے میں دورہ کر رہے ہیں اور مختلف مقامات پر مسلم لیگیں قائم کر رہے ہیں۔ گذشتہ شب کو لاہور میں ایک ایسا ہی بڑا کامیاب جلسہ ہوا، دوسرے جلسے برابر ہوتے رہیں گے۔"

سر سکندر حیات نے حضرت علامہ سے ملاقات کے دوران میں غلام رسول خاں کی جگہ کسی نئے سیکرٹری کی تقرری کا مطالبہ کیا۔ حضرت علامہ نے ملک برکت علی کا نام تجویز کیا تو سر سکندر حیات نے اس تجویز کیا۔ حضرت علامہ نے خلیفہ شجاع الدین کا نام لیا تو یہ نام بھی سر سکندر نے ناپسند کیا اور نوابزادہ خورشید علی خاں کا نام تجویز کیا۔ اس پر حضرت

---

[1]:- اقبال کے خطوط جناح کے نام (شیخ محمد اشرف لاہور)

علامہ سخت غصّے میں آگئے اور اس تجویز کو مسترد کر دیا۔

اپنے ایک اور خط (مرقومہ ۱۰ر نومبر ۱۹۳۷ء) میں حضرت علامہ نے محمد علی جناح کی توجہ درج ذیل اُمور کی طرف دلوائی اور لکھا:[1]

"سر سکندر اور اُن کے دوستوں سے بہت سی باتیں کرنے کے بعد میں اس قطعی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ سر سکندر اس سے کم کسی چیز پر راضی نہیں ہوں گے کہ لیگ اور صوبائی پارلیمانی بورڈ کا مکمل اختیار ان کو دے دیا جائے آپ نے ان سے جو سمجھوتہ کیا ہے، اس میں ذکر یہ ہے کہ پارلیمانی بورڈ کی تشکیلِ نَو کی جائے اور اس میں یونینیسٹ پارٹی کو اکثریت حاصل ہو گی۔ سر سکندر نے مجھے بتایا ہے کہ آپ اس پر رضامند ہیں کہ بورڈ میں ان لوگوں کو اکثریت دی جائے۔ میں نے کچھ دن ہوئے آپ کو لکھ کر یہ پوچھا تھا کہ کیا آپ واقعی بورڈ میں یونینیسٹ پارٹی کو اکثریت دینے کے لئے راضی ہو گئے تھے۔ اس بات میں مجھے ابھی تک آپ کا جواب موصول نہیں ہوا ہے۔ ذاتی طور پر مجھے اس بات میں کوئی ہرج نہیں معلوم ہوتا کہ اپنے لئے جو اکثریت چاہتے ہیں وہ انہیں دے دی جائے۔ مگر جب وہ چاہتے ہیں کہ لیگ کے تمام عہدہ داران کو ہی بدل دیا جائے تو وہ سمجھوتے سے ہٹ جاتے ہیں۔ مثلاً ان کا یہ مطالبہ کہ سیکرٹری بدلا جائے جس نے لیگ کے لئے اتنا کچھ کام کیا ہے وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ لیگ کے روپے پیسے کے معاملات پر بھی ان کے آدمیوں کا اختیار ہو۔ میرے خیال میں تو وہ اس طرح لیگ پر اپنا قبضہ جما کر آخر میں اسے قتل کر دینا چاہتے ہیں۔ مجھے صوبے کی رائے کا جہاں تک علم ہے اس کے پیشِ نظر میں یہ ذمہ داری نہیں لے سکتا کہ لیگ سر سکندر اور ان کے آدمیوں کے حوالے کر دی جائے اس سمجھوتے نے صوبے میں لیگ کے وقار کو پہلے ہی کافی صدمہ پہنچایا ہے اور یونینیسٹ حضرات کی عیاریاں اسے اور بھی نقصان پہنچائیں گی ان لوگوں نے ابھی تک لیگ کے نصب العین پر دستخط نہیں کئے ہیں۔ اور مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ کرنا بھی نہیں چاہتے۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ لیگ کا اجلاس لاہور میں بجائے فروری کے اپریل میں منعقد ہو۔

---

[1]:- اقبال کے خطوط جناح کے نام (شیخ محمد اشرف لاہور)

"میرا احساس یہ ہے کہ اس لیت و لعل سے اُن کا مقصد یہ ہے کہ آہستہ آہستہ اُن کی زمیندارہ لیگ کے پاؤں جم جائیں۔ شاید آپ کو معلوم ہوگا کہ لکھنؤ سے واپس آکر سر سکندر نے ایک زمیندارہ لیگ بنائی تھی اور اب سارے صوبے میں اس کی شاخیں قائم کی جا رہی ہیں۔

اندریں حالات آپ ازراہِ کرم مطلع فرمائیے کہ ان حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔ اگر ممکن ہو تو بذریعہ تار اپنی رائے سے آگاہ فرمائیں اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو جلد از جلد ایک تفصیلی خط تحریر کریں۔"

۷ مئی ۱۹۳۷ء کو لاہور کے اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ میں میاں احمد یار خاں دولتانہ کا ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں اُنہوں نے یہ انکشاف کیا تھا کہ پنجاب میں کانگرس کو مقبول عام بنانے کے لئے ہائی کمان نے ڈھائی لاکھ روپیہ خرچ کرنے کا ایک وسیع منصوبہ بنایا ہے اور اس کی تفصیلات طے کرنے کے لئے مولانا ابوالکلام آزاد لاہور آنے والے ہیں۔ یہ روپیہ ڈاکٹر محمد عالم بیرسٹر ایٹ لاء کی تحویل میں رہے گا اور کانگرس لاہور سے ایک روزنامے کا اجراء کرے گی۔ خبر پڑھتے ہی ڈاکٹر عالم نے اخبار کے انگریز ایڈیٹر اور مضمون نگار پر ازالہ حیثیتِ عرفی کا استغاثہ دائر کر دیا۔ پنڈت جواہر لال کو بطور گواہ طلب کیا گیا۔ چنانچہ وہ شہادت دینے کے لئے جنوری ۱۹۳۸ء میں لاہور آئے تو حضرت علامہ کی خواہش پر اُن سے ملاقات کرنے کی رہائش گاہ پر بھی گئے۔ اس ملاقات کا ڈاکٹر جاوید اقبال نے ان الفاظ میں نقشہ کھینچا ہے:[1]

"ان (ابا جان) کی وفات سے کوئی دو ایک ماہ پیشتر ایک شام پنڈت نہرو کو ان سے ملنے کے لئے آنا تھا۔ ابا جان نے مجھے حکم دیا کہ پنڈت نہرو کے استقبال کے لئے ڈیوڑھی میں کھڑا رہوں۔ میں نے تعجب سے پوچھا:۔

پنڈت نہرو کون ہیں؟ کہنے لگے جس طرح محمد علی جناح مسلمانوں کے قائد ہیں اسی طرح پنڈت نہرو ہندوؤں کے سربراہ ہیں۔ میں باہر کھڑا پنڈت جی کا انتظار کرتا رہا۔ جب تشریف لائے تو میں نے انہیں السلام علیکم کہا اور انہوں نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر سلام کا جواب دیا۔ میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور پھر نہایت شفقت سے میری کمر میں

---

[1]:۔ مے لالہ فام ص۸۷

میں ہاتھ ڈال کر میرے ساتھ ابا جان کے کمرے میں داخل ہوئے۔ ابا جان انہیں بڑے تپاک سے ملے اور صوفے پر بیٹھنے کو کہا۔ مگر پنڈت جی نے نیچے فرش پر بیٹھنے پر اصرار کیا۔ بالآخر وہ فرش پر چوکڑی مار کر بیٹھ گئے اور ابا جان بستر پہ لیٹے ان سے باتیں کرنے لگے۔"

پنڈت نہرو نے اس ملاقات کو اپنی کتاب میں قلمبند کیا ہے اور لکھا ہے:[ل]۔

"۔۔۔۔ اپنے انتقال سے چند ماہ پیشتر جب وہ بسترِ علالت پر تھے، انہوں نے مجھے یاد فرمایا اور نہایت خوشی سے اس ارشاد کی تعمیل میں اُن کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں نے محسوس کیا کہ اختلافات کے باوجود ہمارے درمیان کس قدر باہمی اشتراک موجود تھا۔ اور مجھے یہ بھی محسوس ہوا کہ اس شخص کے ساتھ کام کرنا کتنا آسان اور سہل ہے۔ وہ اس وقت پرانی یادیں تازہ کر رہے تھے۔ گفتگو مختلف موضوعات پر ہوتی رہی جس میں خود میں نے بہت کم حصہ لیا بلکہ زیادہ تر اُنہی کی باتیں سنتا رہا۔ میں اُن کی شاعری کا مداح ہوں اور مجھے یہ معلوم کر کے بے حد خوشی ہوئی کہ وہ بھی مجھے پسند فرماتے اور میرے متعلق اچھی رائے رکھتے ہیں۔"

پنڈت جواہر لال نہرو مختلف مواقع پر یہ نشاندہی کر چکے تھے کہ ہندوستان کے تمام مصائب کا حل اشتراکیت میں مضمر ہے۔ دورانِ ملاقات میں حضرت علامہ نے اُن سے استفسار فرمایا کہ "اشتراکیت کے مسئلہ پر کانگرس کے کتنے اصحاب آپ کے ہم خیال ہیں"؟۔

پنڈت نہرو نے جواب دیا کہ "نصف درجن کے لگ بھگ"۔

حضرت علامہ نے اس پر استعجاباً فرمایا:

"خود آپ کی جماعت میں آپ کے ہمنوا محض نصف درجن کے قریب ہیں۔ ادھر آپ مجھ سے یہ کہتے ہیں کہ میں مسلمانوں کو کانگرس میں شامل ہو جانے کا مشورہ دوں۔ تو کیا میں دس کروڑ مسلمانوں کو چھ

ل The Discovery of India.298.

آدمیوں کی خاطر آگ میں جھونک دوں۔"

اس پر پنڈت نہرو خاموش ہو گئے۔

اس کے بعد عالمی سطح پر مغربی ایشیا کے کردار کی بات چھڑی تو حضرت علامہ نے فرمایا کہ مغربی ایشیا فی الواقعہ اسلامی ایشیا ہے اور ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ ناروا سلوک کا نتیجہ ہندوؤں کے مغربی ایشیا کے مسلمانوں کے ساتھ تعلقات میں خرابی پیدا کرنے کی صورت میں نکل سکتا ہے۔

گفتگو کا یہ سلسلہ جاری تھا کہ میاں افتخار الدین، جن کے ہاں پنڈت نہرو نے قیام کیا تھا، نے لقمہ دیا کہ حضرت علامہ خود مسلمانوں کے قائد کیوں نہیں بن جاتے کیونکہ مسلمان اُن کی مسٹر جناح کی نسبت زیادہ عزت کرتے تھے اور اُن کی کانگرس کے ساتھ بات چیت زیادہ بہتر نتائج پیدا کرے گی۔

حضرت علامہ خوب سمجھتے تھے کہ لیگ کے مخالفین کدھر اور کس سمت میں موجود ہیں۔ وہ یہ سُنتے ہی اُٹھ کر بیٹھ گئے اور واشگاف الفاظ میں بتا دیا کہ وہ محمد علی جناح کو ہی مسلمانوں کے حقیقی قائد سمجھتے ہیں اور وہ تو اُن کے معمولی سپاہی ہیں۔

اس پر کمرے میں گھمبیر خاموشی چھا گئی اور چند لمحات کے بعد پنڈت نہرو نے رخصت چاہی۔ حضرت علامہ اور پنڈت نہرو کی اس ملاقات نے کئی حلقوں میں شُبہات پیدا کئے۔ ۲۴ جنوری کی شام کو میاں بشیر احمد، مُدیر ہمایوں نے حضرت علامہ سے استفسار کیا کہ اُن کی یہ رائے کہ پنڈت نہرو محبِ وطن ہیں اور مسٹر جناح قانون دان[1]، کی اصل حقیقت کیا ہے، کیونکہ مسلمانوں کا اپنا کوئی مرکز اطلاعات اور نشر و اشاعت نہ ہونے کی وجہ سے غلط پروپیگنڈے کا خدشہ تھا۔

حضرت علامہ نے توضیح کی کہ اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ مسٹر جناح میں حُب الوطنی کی کمی ہے یا کہ پنڈت نہرو بہت بڑے سیاستدان ہیں — میرا کہنا تو یہ تھا کہ پنڈت نہرو کی نظر حقائق پر نہیں جیسا کہ ایک سیاستدان کی

---

[1]: حضرت علامہ نے فرمایا تھا:

"Jinnah is a politician, you are a patriot."

ہونی چاہیئے۔ وہ جذبات کی رَو میں بہہ رہے ہیں، گو بسبب جذبۂ حُب الوطنی۔ لیکن یہ امر سیاست کے منافی ہے۔ برعکس اس کے مسٹر جناح سیاستدان ہیں، ان کا مزاج قانونی ہے اور وہ خوب سمجھتے ہیں، ہندوستان کا اصل مسئلہ کیا ہے۔ یہ بھی کہ ہندوؤں اور انگریزوں میں جو کشمکش جاری ہے اس کی حقیقی نوعیت کیا ہے۔ وہ یہ نہیں کہہ رہے کہ حُب الوطنی کے جوش میں واقعات سے آنکھیں بند کرلیں۔ وہی تو حقیقت میں محب الوطن ہیں۔[1]

اُن دنوں یہ نعرۂ مستانہ ہر طرف گونج رہا تھا کہ ؏

مُسلم ہے تو مُسلم لیگ میں آ

تو یہ سوال بھی کئی حلقے پوچھ رہے تھے کہ آیا مرزائی (مرزا غلام احمد قادیانی کے مقلّد) مسلمانوں ہی میں سے ہیں یا وہ الگ قوم ہیں۔ پنجاب لیجسلیٹو کونسل میں جانے ۔ائے مسلم لیگی اُمیدواروں کا حلف نامہ تیار کرنے کا کام ایک ذیلی کمیٹی کے سپرد ہوا۔[2] ولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے اس پر اصرار کیا تھا کہ یہ شِق بھی بڑھائی جائے کہ سلم لیگی اُمیدوار کو اقرار صالح کرنا چاہیئے کہ وہ اسمبلی میں جاکر مرزائیوں کو مسلمانوں سے ارج کرا کے ایک علیحدہ اقلیت دیئے جانے کی پوری کوشش کرے گا۔ بعد میں لام رسول خاں حلف نامے کا مسوّدہ لے کر حضرت علامہ کی خدمت میں پیش ہوئے ر مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی کے اصرار کا واقعہ گوش گذار کیا تو انہوں نے اس ق کے بڑھائے جانے پر کسی تعجب کا اظہار نہ فرمایا اور نہ کوئی اعتراض کیا۔[3]

دوسری طرف مرزا محمود احمد نے محمد علی جناح کو لکھا کہ اگر اُن کی جماعت کو لیگ ں شامل نہ کیا گیا تو وہ مجبوراً کانگرس میں شمولیت اختیار کرے گی۔ محمد علی جناح نے یہ خط رت علامہ کو بھیج دیا جنہوں نے ایک سوال کے جواب میں ۱۵ر فروری ۱۹۳۸ء کو ارشاد فرمایا۔[4]

۱۔ اقبال کے حضور نشستیں اور گفتگوئیں جز اول صہ ۱۰۳

۲۔ ان دنوں مسلم لیگ اور مجلس احرار کے درمیان اتحاد تھا جو بعد میں تارِ عنکبوت ثابت ہوا

۳۔ اقبال کے آخری دو سال صہ ۳۲۹

۴۔ اقبال کے حضور نشستیں اور گفتگوئیں جز اول صہ ۱۹۳

"لیگ میں شامل ہوں یا کانگرس میں۔ ہم ان کی شمولیت کو کوئی اہمیت نہیں دیتے، جو جی چاہے کریں۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ مرزا صاحب کے نزدیک ہم مسلمان، مسلمان ہیں یا نہیں؟ اگر ہیں اور انہی بھی اسلام کا دعویٰ ہے تو پھر لیگ یا کانگرس میں شرکت اور عدمِ شرکت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انہیں بہرحال لیگ میں شامل ہونا چاہیئے۔ لیکن مرزا صاحب تو لیگ اور کانگرس سے سودا کرنا چاہتے ہیں اور یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ یا تو بحیثیت ایک جماعت وہ مسلمانوں سے الگ رہنا چاہتے ہیں، یا ہمیں مسلمان نہیں سمجھتے۔ میں نے بہرحال مسٹر جناح کو لکھ دیا ہے کہ اس قسم کے خطوں کا کوئی جواب نہ دیں۔"

مسجد شہید گنج کی اپیل ابھی تک ہائی کورٹ کے فل بنچ کے رُوبرو پیش تھی۔ ۲۶ جنوری ۱۹۳۸ء کو یہ اپیل خارج کردی گئی۔ مسلمانوں میں ایک جوش تو پہلے ہی پھیلا ہُوا تھا لیکن عملی اقدام کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ اُسی شام کو غلام رسول خان حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو وہ بھی افسردہ تھے۔ غلام رسول خاں نے عرض کی کہ اب کیا کرنا چاہیئے۔ اس پر حضرت علامہ رو پڑے اور فرمایا۔ "مجھ سے کیا پوچھتے ہو میری چارپائی کو اپنے کندھوں پر اُٹھاؤ اور اُس طرف لے چلو، جدھر مسلمان جا رہے ہیں۔ اگر گولی چلی تو میں بھی اُن کے ساتھ مروں گا۔"[1]

۳۰ جنوری کو دہلی میں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ہُوا تاکہ حالات پر غور کیا جا سکے لیکن کوئی فیصلہ کن بات طے نہ ہوئی یہ فیصلہ کیا گیا کہ لیگ کا ایک خصوصی اجلاس جلد ہی منعقد ہوگا جس میں آئندہ کے لائحہ عمل کے بارے میں غور کیا جائے گا۔ نیز یکم فروری کو یوم شہید گنج منانے کا بھی فیصلہ کیا گیا۔ لیکن ان اقدامات سے نہ ہندو مرعوب ہوئے۔ نہ سکھ اور نہ انگریز

حضرت علامہ ایک مختلف نہج پر سوچ رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ قانون ہی ختم ہونا چاہیئے جس سے خانۂ خدا کا تقدس ختم ہوتا ہے۔ چنانچہ ان کی ہدایت اور مشورے

---

[1] اقبال کے آخری دو سال صـ ۵۷۸

سے ملک برکت علی نے تحفظ مساجد کا ایک مسوّدہ قانون تیار کیا جو تمام تر حضرت علامہ ہی کی کاوشِ فکر کا نتیجہ تھا۔ عبارت صرف ملک برکت علی کی تھی۔

اصل مسوّدہ قانون انگریزی میں تھا اسے اردو کے قالب میں عاشق حسین بٹالوی نے ڈھالا تھا۔ ترجمہ کرنے کے بعد وہ اسے ملک برکت علی کے دفتر میں رکھ آئے کہ ملک صاحب مکان پر تشریف نہ رکھتے تھے لیکن شام کو اُن کے استفسار پر بٹالوی صاحب اُن کے دفتر میں گئے لیکن ترجمہ بمعہ مسودہ دونوں غائب تھے۔ خوش قسمتی سے ملک صاحب کے پاس ایک فاضل نقل موجود تھی۔ مکرّر ترجمہ ہو گیا۔ اور غائب ہونے والا ترجمہ اور مسوّدہ یونینسٹ پارٹی کے صدر دفتر میں پہنچ چکا تھا۔ لیکن ملک صاحب کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا مسوّدہ موجود تھا۔ ملک صاحب نے پنجاب اسمبلی میں تحفظِ مساجد کا بل پیش کرنے کا نوٹس دے دیا۔ مسوّدہ درج ذیل تھا[1]۔

"ہرگاہ کہ اس قسم کے شکوک وشبہات پیدا ہو رہے ہیں کہ جن مساجد کو شرعِ محمدیؐ کے تحت باضابطہ وقف قرار دیا جا چکا ہے۔ اُن پر شرع مذکور کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ اور اس ضمن میں دعویٰ کیا گیا کہ بارہ سال کے قبضۂ مخالفانہ کے بعد مساجد بھی اپنی اصل حیثیت کھو بیٹھتی ہیں۔ ہرگاہ کہ یہ ضروری ہے کہ اس نوع کے تمام شکوک وشبہات کا ازالہ کیا جائے اور قانون کی وضاحت کی جائے۔ لہٰذا اس تحریر کے ذریعے سے مندرجہ ذیل قانون وضع کیا جاتا ہے:۔

۱۔ اس ایکٹ کا نام تحفظ مساجد اسلامی پنجاب ایکٹ ۱۹۳۸ء ہوگا۔

۲۔ ا:۔ یہ ایکٹ صوبہ پنجاب میں فوراً نافذ کیا جائے گا۔ اور اس کا اثر راجع بہ ماضی ہوگا۔ جو تمام قسم کے مقدمات پر حاوی ہوگا۔ مثلاً دعاوی اپیلیں یا دوسری جملہ کارروائیاں خواہ اُن کا فیصلہ ہو چکا ہے یا ہنوز زیر تحقیقات ہیں۔

ب:۔ اگر اس ایکٹ کے وضع ہونے سے پہلے کسی مقدمے کا فیصلہ ہو چکا ہے اور وہ فیصلہ اس ایکٹ کی دفعات کو کسی طرح بھی ساقط یا کمزور نہیں کر سکے گا۔

۳۔ قطع نظر اس سے کہ پنجاب کے کسی موجودہ رائج الوقت قانون یا ایکٹ میں کوئی

---

[1] ۔ ایضاً ص ۶۱۵ - ۶۱۶

بات اس امر کے خلاف درج ہے۔ ایک اسلامی مسجد، جسے شرع محمدیؐ کے تحت باقاعدہ وقف قرار دیا جا چکا ہے، اپنی حیثیت برقرار رکھے گی، خواہ اس کا متولی محافظ یا قابض کوئی شخص ہو، اور اس شخص مذکور کا قبضہ کسی نوعیت کا ہو۔ اور اپنے جملہ حقوق و واجبات کے لئے اس مسجد پر ہر حالت میں صرف شرع محمدیؐ کا اطلاق ہوگا۔ بلا لحاظ اس سے کہ ایسی عدالتی کاروائی میں جہاں مسجد کی حیثیت زیر بحث ہے، فریقین کی نوعیت کیا ہے۔

تشریح :- ایک اسلامی مسجد جسے شرع محمدیؐ کے تحت وقف قرار دیا جائے، عام انسانی ضروریات کے استعمال سے الگ کر دی جاتی ہے اور اُسے سراسر اور کلیتہً خدائے ذوالجلال کی عبادت کے لئے وقف کر دیا جاتا ہے، اُسی پر لفظ جائیداد اُن معنوں میں استعمال نہیں ہوتا جن معنوں میں یہ لفظ قانونِ میعاد ہند یا پنجاب کے کسی موجودہ رائج الوقت قانون میں مستعمل ہے۔ بجز اس کے کہ :-

ا :- حقِ شفع کی رُو سے قانون رائج الوقت کے تحت جائیداد حاصل کی جائے۔

اور

ب :- قانونِ فوجداری کی غرض کے لئے جس میں تعزیراتِ ہند اور ضابطہ فوجداری دونوں شامل ہیں۔

اغراض و اسباب :- اپیل اوّل نمبر ۲۴۴ سال ۱۹۳۶ء بہ عنوان "مسجد شہید گنج و دیگر بنام شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی وغیرہ"، منفصلہ ۲۶ جنوری ۱۹۳۶ء میں لاہور ہائی کورٹ کے فُل بنچ کی اکثریت نے فیصلہ کیا ہے کہ اگرچہ شرع محمدیؐ کے تحت ایک مسجد، جسے خانہ خدا کے طور پر وقف کیا جا چکا ہے ہمیشہ مسجد ہی رہتی ہے۔ اور اپنی حُرمت و تقدیس تا قیامت برقرار رکھتی ہے۔ خواہ اُس مسجد کا متولی کوئی شخص ہو، اور اُس کا قبضہ کسی نوعیت کا ہو، لیکن از بسکہ قانونِ میعاد ہند بہ شمول پنجاب لاز ایکٹ نے شرعِ محمدیؐ کے اس حصے کو ترمیم و تبدیل کر دیا ہے، لہٰذا برٹش انڈین قانون بحالت موجودہ کے تحت ایک مسجد بھی بارہ سال کے قبضۂ مخالفانہ کے بعد اپنی مقدس حیثیت کھو بیٹھتی ہے اور عام دنیاوی جائیداد کی مانند اس شخص کی ملکیت بن جاتی ہے، جو بارہ سال سے اُس پر قابض چلا آ رہا ہے۔

اور وہ شخص اس مسجد کو ہر غرض کے لئے استعمال کرنے کا مجاز ہے خواہ وہ غرض انتہائی درجہ ناپاک کیوں نہ ہو۔

اگرچہ آنریبل مسٹر جسٹس دین محمد نے اس رائے سے اختلاف کیا ہے اور اپنے فیصلے میں لکھا ہے کہ قانونِ میعاد ہند یا پنجاب لاز ایکٹ نے اس ضمن میں شرع محمدی میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ اور بدیں وجہ جب مسجد کو عام دُنیاوی اغراض سے الگ کر کے محض خدائے واحد کی عبادت کے لئے وقف کر دیا جاتا ہے تو قانون رائج الوقت کے تحت بھی اُس کی حُرمت و تقدیس ابدالاباد تک قائم رہتی ہے لیکن اس کے باوجود یہ ضروری خیال کیا گیا ہے کہ قانون کو واضح اور مستحکم بنانے کی غرض سے مجلس قانون ساز ایک ایسا توضیحی اعلان کرے جس میں اس امر کو ہر قسم کے شک و شُبہ سے بالکل صاف کر دیا جائے کہ جب مسجد کو شرعِ محمدی کے تحت باقاعدہ وقف قرار دیا جاتا ہے تو وہ مسجد شرع مذکور کے مطابق اپنی مقدس حیثیت کو ہمیشہ برقرار رکھتی ہے، اور اپنے جُملہ حقوق و واجبات کے لئے اُس مسجد پر، ہر حالت میں صرف شرع محمدی کا اطلاق ہونا چاہیئے۔ بلا لحاظ اس کے کہ ایسی عدالتی کاروائی میں جہاں مسجد کی حیثیت زیر بحث ہے۔ فریقین کی نوعیت کیا ہے۔ مزید برآں اس امر کو بالکل واضح کر دینا چاہیئے کہ مسجد پر عام معنوں میں لفظ جائیداد استعمال نہیں ہو سکتا۔ اور اگر پنجاب کے کسی موجودہ رائج الوقت قانون میں لفظ جائیداد کہیں استعمال ہُوا ہے تو مسجد پر وہ لفظ مستعمل نہیں ہوگا۔ ماسوا اس کے کہ:۔

(ا) حقِ شفع کی رُو سے قانون رائج الوقت کے تحت جائیداد حاصل کی جائے۔ اور

(ب) قانون فوجداری کی غرض کے لئے جس میں تعزیرات ہند اور ضابطہ فوجداری دونوں شامل ہیں تاکہ مسجد کی حُرمت و تقدیس کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچ سکے۔

اس مسودہ قانون کو راجع بہ ماضی قرار دیا گیا ہے تاکہ اس وسیع روز افزوں اور حق بجانب اضطراب کو رفع کیا جائے جو مسجد شہید گنج کے انہدام سے لے کر اب تک بڑی شدت سے جاری ہے اور جسے اگر دانشمندانہ تدبر اور مجلس قانون ساز کے دلیرانہ اقدام سے اس وقت رفع نہ کیا گیا تو نہ صرف اس صُوبے بلکہ پورے ہندوستان کے امن و امان کو شدید صدمہ پہنچنے کا احتمال ہے اور اندیشہ ہے کہ اس طرح انجام کار پوری مملکت ایک خطرناک اور غیر مختتم خانہ جنگی کا شکار ہو کر رہ جائے گی۔ جب اس نوع کی

صورتِ حال درپیش ہو تو مجلس قانون ساز پر فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ آگے بڑھے اور ایک ایسا قانون وضع کر کے ملک کے امن وامان کو محفوظ کرے۔ جس کی رُو سے ملک معظم کی مسلمان رعایا کو واضح ترین الفاظ میں مطمئن کیا جا سکے۔ کہ اس ضمن میں اُس کے مذہبی عقائد و شعائر کی مکمل حفاظت کی گئی ہے اور یہ کہ ۱۸۵۷ء میں ملکہ وکٹوریہ آنجہانی نے اس موضوع پر جن واضح اور غیر مشتبہ الفاظ میں اپنی مسلمان رعایا کو یقین دلایا تھا اور جن الفاظ کا اعادہ ملکۂ آنجہانی کے جانشین تخت شاہی سے بار بار کرتے رہے ہیں اُن کو عملی جامہ پہنانے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا گیا۔"

نوٹس مسوّدہ پیش کرنے پر یونینسٹ پارٹی کے کچھ مسلمان ارکان بھی اس کی حمایت پر آمادہ ہو گئے۔ اب سر سکندر حیات کو پریشانی لاحق ہوئی کیونکہ اُن کی مخالفت سے اُن کی پارٹی کے اندر پھوٹ پڑنے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ انہوں نے گورنر کو مشورہ دیا کہ بل اسمبلی میں پیش کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اُدھر گوردوارہ بندھک کمیٹی نے ۱۱ مارچ کو اعلان کر دیا کہ وہ شہید گنج کے مسئلے پر مسلمانوں سے کوئی مذاکرات نہیں کرے گی۔ سر سکندر حیات کو اس اقدام پر مسٹر گاندھی کے علاوہ مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی مبارک باد دی[1]۔

مسلم لیگ کے اجلاس لکھنؤ منعقدہ اکتوبر ۱۹۳۷ء میں یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ ہر صوبے کی لیگ کی ضلعی اور تحصیل وار شاخیں ہونی چاہئیں۔ اسی ضمن میں محمد علی جناح نے ۱۲ فروری ۱۹۳۸ء کو دہلی سے حضرت علامہ کو درج ذیل گشتی مراسلہ ارسال کیا[2]

جناب مکرم:۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے گذشتہ سالانہ اجلاس میں اس امر کا فیصلہ ہوا تھا کہ آئندہ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اراکین اور مندوبین کے تمام انتخابات نئے آئین کی دفعات کے مطابق ہوں اور ۲۰ جنوری ۱۹۳۸ء تک اس کی اطلاع دفتر آل انڈیا مسلم لیگ میں پہنچ جائے۔

کونسل کے آخری اجلاس منعقدہ ۳۱ جنوری ۱۹۳۸ء میں مذکورہ بالا میعاد کی توسیع ۳۱ مارچ تک کی گئی تھی۔ میرے خیال میں یہ امر بے حد ضروری ہے کہ

---

[1]:۔ اقبال کے حضور نشستیں اور گفتگوئیں جز اول ص ۳۲۴

[2]:۔ اقبال کے آخری دو سال ص ۲۳۰-۲۳۲

یہ تمام انتخابات جس قدر جلد ممکن ہو عمل میں آ جانے چاہئیں تاکہ صوبائی لیگیں اس خصوصی اجلاس میں شامل ہو سکیں، جو آئین جدید کے مطابق فی الفور ہونے والا ہے۔ اور جس میں مسئلہ شہید گنج کے متعلق آخری طریق عمل کا فیصلہ کیا جائے گا۔ لہٰذا میری تجویز ہے کہ ۱۵ر مارچ ۱۹۳۸ء سے قبل ہی تمام صوبائی لیگیں اپنے الحاق کی درخواستیں ارسال کر دیں جن میں صدر، سیکرٹری اور تمام عہدیداروں کے نام درج ہوں نیز کونسل کے منتخب شدہ اراکین کے ناموں کی فہرست ۱۵ر مارچ ۱۹۳۸ء اور مندوبین کی فہرست ۳۱ر مارچ تک پہنچ جانی چاہئیں۔

میں امید کرتا ہوں کہ آپ کی صوبائی مسلم لیگ اس معاملے کی اہمیت کا احساس کرتے ہوئے الحاق کی درخواست اور نمائندگان کے ناموں کی فہرست مقررہ وقت پر لیگ کے مرکزی دفتر کوچہ بلی ماراں دہلی کو بھیج دے گی تاکہ لیگ کے آئندہ اجلاس خصوصی میں جس میں نہایت اہم معاملات پر بحث و تمحیص ہوگی آپ کے صوبے کی پوری پوری نمائندگی ہو سکے۔

براہ مہربانی اپنے صوبے کی منظم شدہ ڈسٹرکٹ مسلم لیگوں کی فہرستیں معہ اسمائے عہدیداران ارسال فرمائیے۔ نیز اُن اضلاع کے نام بھی تحریر فرمائیں جن میں ابھی تک لیگ کی شاخیں قائم نہیں ہو سکیں اور اس امر کی اطلاع بھی بہم پہنچائیں کہ ایسے اضلاع میں کب تک شاخیں قائم ہو جانے کا امکان ہے۔"

اس خط کا جواب غلام رسول خاں، آنریری سیکرٹری پنجاب صوبائی مسلم لیگ نے ۱۷ر فروری ۱۹۳۸ء کو حضرت علامہ کی ہدایات کے بموجب بھیجا[1]

"آپ کی گشتی چھٹی ۵۶۶ء مورخہ ۱۲ر فروری ۱۹۳۸ء کے جواب میں ڈاکٹر سر محمد اقبال نے مجھے یہ تحریر کرنے کی ہدایت فرمائی ہے۔

۱۔ مذکورہ بالا گشتی چٹھی میں آپ نے جو ہدایات دی ہیں انہیں عملی جامہ پہنانے کے لئے مناسب اقدامات کئے جا رہے ہیں۔

---

[1] ایضاً ص ۶۳۲ — ۶۳۲

۲۔ جہاں تک لیگ کے اجلاس خصوصی کا سوال ہے معلوم ہوتا ہے کہ آپ یہ اجلاس لیگ کے نئے آئین کے مطابق کر رہے ہیں مگر آپ کو اس امر کا پورا احساس ہوگا کہ اس خاص اجلاس میں جو مسئلہ زیر بحث آئے گا وہ بے حد اہم ہے اور تمام مسلمانانِ ہند پر بالعموم اور مسلمانانِ پنجاب پر بالخصوص اثر انداز ہوگا۔

یہ امر اس بات کا متقاضی ہے کہ کھلے اجلاس میں اہلِ بصیرت مسلمانوں کی بڑی سے بڑی اکثریت اس پر بحث کرے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے آئین کی رُو سے پنجاب سے تین سو ساٹھ سے زیادہ مسلمان اس اجلاس میں شریک نہیں ہو سکتے۔ اور وہ بھی اس صورت میں کہ یہ تمام اراکین وہاں پہنچ جائیں۔ ہمیں اس بات کا علم نہیں کہ دوسرے صوبوں کے مسلمانوں کے احساسات بھی پنجاب کے مسلمانوں کے احساسات بھی پنجاب کے مسلمانوں کی طرح شدت سے مجروح ہوئے ہیں یا نہیں۔ اگر لیگ سول نافرمانی کا فیصلہ کرے تو مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس فیصلہ کا انحصار اُن ہی لوگوں پر رکھا جائے جن پر اس تحریک کو کامیابی کے ساتھ چلانے کا بوجھ ڈالا جائے گا۔

آپ جانتے ہیں کہ آئین جدید کی رُو سے یہ امر ممکن نہیں۔ اس لئے ہماری تجویز یہ ہے کہ خاص اجلاس پُرانے آئین ہی کے تحت ۳۱ مارچ ۱۹۳۸ء سے پہلے منعقد کر لیا جائے۔ کیونکہ پرانے آئین کی رُو سے ہر مسلمان ایک روپیہ ادا کر کے بحث میں حصہ لے سکتا ہے۔ اگر آپ کا خیال ہے کہ ۳۱ مارچ بہت قریب ہے تو پھر ہماری یہ تجویز ہے کہ آپ نئے آئین کے نفاذ کو خاص اجلاس تک ملتوی کر دیں۔ اور یہ اجلاس ۳۱ مارچ کے بعد مناسب تاریخوں میں منعقد کر لیا جائے۔ اگر یہ دونوں تجویزیں آپ کو منظور نہ ہوں تو پھر ہماری درخواست ہے کہ آپ خاص اجلاس کی بجائے ہندوستانی مسلمانوں کی ایک خاص کانفرنس منعقد کریں جس میں ہر بالغ مسلمان کو شامل ہونے کی اجازت ہو ظاہر ہے کہ یہ کانفرنس بھی لیگ کے زیر اہتمام اور آپ ہی کے زیر صدارت منعقد ہوگی۔"

محمد علی جناح نے اس خط کا تو کوئی جواب نہ دیا البتہ ۲ مارچ ۱۹۳۸ء کو

درجِ ذیل خط حضرت علامہ کو ارسال کیا۔[1]

"اطلاعاً عرض ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا ایک اجلاس ماہِ حال کی ۲۰ تاریخ کو دہلی میں منعقد ہو رہا ہے۔ اُن اہم اُمور میں سے جن پر اس اجلاس میں غور کیا جائے گا ایک یہ بھی ہے کہ لیگ کے خاص اجلاس کے لئے مناسب مقام کا فیصلہ کیا جائے اس لئے مجھے یہ معلوم کرنے کی بے حد خواہش ہے کہ آیا آپ یہ پسند کرتے ہیں کہ نہیں کہ خاص اجلاس لاہور میں منعقد ہو۔ اگر آپ کا جواب اثبات میں ہے تو کیا صوبائی مُسلم لیگ خاص اجلاس کے لئے ضروری انتظامات کر سکے گی؟ بصورتِ اثبات آپ مجھے ایک رسمی دعوت نامہ ارسال فرمائیں تاکہ میں اُسے کونسل کے سامنے پیش کر سکوں۔ مجھے بنگال سے رسمی دعوت نامہ موصول ہو چکا ہے اور اگر اجلاس دہلی میں منعقد کرنے کا فیصلہ کیا جائے تو اہل دہلی انتظام کرنے کو تیار ہیں۔ پنجاب کی صورتِ حال کے متعلق بھی مفصل اطلاع دیں۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہو گا۔"

حضرت علامہ یہ شدت سے محسوس کرتے تھے کہ جب یونینسٹوں کا پنجاب میں زور ہے، مسلمانوں کا ملّی تشخص اُجاگر نہیں ہو سکتا۔ علاوہ ازیں وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ اُن کے خطبہ الٰہ آباد کی تعبیر ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی یہ دلی خواہش تھی کہ آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس اسلامی اقلیت کے کسی صوبے کی بجائے پنجاب میں منعقد کیا جائے کیونکہ وہاں تو بیداری پیدا ہو چکی ہے۔ اکثریت والے صوبوں میں یہ ضروری ہے کہ مفاد پرست جماعتوں پر ضرب کاری لگائی جائے جو اسلامی سیاست کا نقاب اوڑھے مسلمانوں کو گمراہ کر رہی ہیں۔ پنجاب میں اجلاس منعقد کرنے کے لئے الیکٹر کی تعطیلات، حضرت علامہ کی تطہیر کا موقعہ نہایت موزوں تھا۔ چنانچہ ۷ مارچ ۱۹۳۸ء کو محمد علی جناح کے مُراسلے کا جواب غلام رسول خاں کے حسبِ ارشاد حضرت علامہ ارسال کیا۔[2]

---

[1] ایضاً ص ۶۱۷ [2] ایضاً ص ۶۱۸ - ۶۲۰

"مجھے ڈاکٹر سر محمد اقبال کی طرف سے ذیل کا خط لکھنے کی ہدایت ہوئی ہے:۔
آپ کا خط ڈاکٹر موصوف کو ۴ر مارچ ۱۹۳۸ء کو ملا۔ اُن کی صحت کی خرابی ہم سب نیاز مندوں کے لئے وجۂ اضطراب بنی ہوئی ہے اور وہ خود آپ کو خط لکھنے سے معذور ہیں۔ آپ کے خط کے جواب میں اُن کا ارشاد یہ ہے:۔

کل پنجاب صوبائی مسلم لیگ کا ایک عام اجلاس لاہور میں منعقد ہوا جس میں صوبے کے تمام اضلاع کے نمائندے شامل ہوئے اور صوبائی مسلم لیگ کے ارکان کی ایک بڑی تعداد نے اس میں حصہ لیا۔ آپ نے سر محمد اقبال کو جو خط لکھا تھا وہ اس اجلاس میں پڑھا گیا اور اتفاق رائے سے یہ فیصلہ ہوا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کا خصوصی اجلاس لاہور ہی میں منعقد ہو۔ اور اس کے لئے ایک رسمی دعوت نامہ بھیج دیا جائے۔ لہذا ہماری درخواست ہے کہ شہید گنج کے متعلق لیگ کا اجلاس خصوصی ایسٹر کی تعطیلات میں لاہور میں منعقد کرنے کے لئے اس خط ہی کو دعوت نامہ تصور کیا جائے۔

جہاں تک پنجاب کی صورتِ حال کا تعلق ہے، سر محمد اقبال یہ کہنا چاہتے ہیں کہ:۔

۱۔ شہید گنج کے متعلق غالباً پریوی کونسل میں اپیل کی جائے گی، لیکن لوگوں کو اس سے زیادہ دلچسپی نہیں کیونکہ اس وقت وہ یہ خیال کر رہے ہیں کہ کسی برطانوی عدالت کی طرف رجوع بے سود ہے۔

۲۔ ملک برکت علی نے تحفظِ مساجد کے متعلق پنجاب اسمبلی میں جو بل پیش کرنے کا نوٹس دیا ہے مسلمانوں میں اُس پر کافی جوش پھیلا ہوا ہے اس وقت تک یونینسٹ پارٹی کے پچیس ارکان نے سر سکندر کی ہدایات کے برعکس اخبارات میں اپنے اس عزم کا اعلان کر دیا ہے کہ وہ اس بل کی تائید کریں گے اور اس بل کو انہوں نے اپنا بل بنا لیا ہے۔ نیز صوبے کے تمام ووٹر مناسب قرار دادیں منظور کر کے اپنے نمائندوں سے مطالبہ

کر رہے ہیں کہ اس بِل کی پوری حمایت کی جائے۔ اس لئے اُمید کی جاتی ہے کہ جب یہ بِل منظوری کی غرض سے اسمبلی میں پیش ہوگا تو قانون کی صُورت اختیار کرے گا۔

۳۔ شہید گنج کی سول نافرمانی کی تحریک روز بروز تقویت پکڑ رہی ہے، عوام پُرامن ہیں، اور بے تابی سے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس خصوصی کے اہم فیصلوں کا انتظار کر رہے ہیں جب یہ فیصلہ ہو جائے گا تو پنجاب کے تقریباً تمام مسلم ادارے لیگ کی رہنمائی میں سرگرم عمل نظر آئیں گے۔ پنجاب صوبائی مسلم لیگ آپ کو یقین دلاتی ہے کہ وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاسِ خصوصی کے لئے تمام ضروری انتظامات کرنے کی ذمہ دار ہے۔"

دوسری طرف یونینسٹ پارٹی اور بالخصوص سر سکندر حیات لیگ کے اجلاس کے لاہور میں منعقد کرنے کے سخت خلاف تھے کیونکہ یہ ان کے حق میں اچھا نہ تھا نواب شاہنواز احمد ممدوٹ پنجاب صُوبائی مسلم لیگ کے صدر مقرر کئے جا چکے تھے انہوں نے محمد علی جناح کو درجِ ذیل مُراسلہ بھیجا[1]

"ڈیئر مسٹر جناح!

غالباً آپ کو معلوم ہوگا کہ مجھے پنجاب صُوبہ مسلم لیگ کا صدر منتخب کیا گیا ہے اور سر محمد اقبال کی خواہشات کا احترام کرتے ہوئے میں نے یہ عُہدہ قبول کر لیا ہے۔ ایک جلسے میں جس میں مَیں موجود نہ تھا، یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے خاص اجلاس کے انعقاد کے لئے لاہور کی طرف سے دعوت دی جائے میرا یہ فرض ہے کہ میں آپ پر واضح کر دوں کہ مسلم لیگ اور شہید گنج کی تحریک کے بہترین مفاد اس امر کے متقاضی ہیں کہ لیگ کا خاص اجلاس لاہور میں نہ ہو مسلم لیگ، پنجاب میں ابھی تک ابتدائی منازل میں ہے اور بعض مخالف قوتیں اس کی روز افزوں ترقی اور بڑھتی ہوئی مقبولیت کی راہ میں روڑے اٹکا رہی ہیں۔ اگر لیگ کا خاص اجلاس لاہور میں منعقد ہُوا۔ تو پنجاب کے مشتعل مسلمانوں کی طرف سے آپ پر بے حد دباؤ ڈالا جائے گا۔ اور آپ کو ایسا طرزِ عمل

---

[1]:- ایضاً ص ۶۳۷-۶۳۹

اختیار کرنے پر مجبور کیا جائے گا۔ جو غالباً آپ کے نزدیک پسندیدہ نہ ہوگا۔ اور مجھے ڈر ہے کہ یہ چیز کامیابی کے ساتھ لیگ کے خلاف استعمال کی جائیگی علاوہ ازیں سکھوں نے بھی لاہور میں اُنہی ایّام میں جب لیگ کا خاص اجلاس منعقد کرنے کا خیال ہے ایک بہت بڑا دیوان منعقد کرنے کی تیاریاں ابھی سے شروع کردی ہیں اور بجا طور پر ایک فرقہ وارانہ فساد کا خطرہ محسوس کیا جاسکتا ہے مجھے یقین ہے کہ آپ اس نازک مرحلہ پر اپنی زبردست قابلیت اور بے مثال جُرأت سے کام لے کر مسلمانوں کی صحیح رہنمائی فرمائیں گے۔ تاکہ شہید گنج کے اہم مسئلہ پر ایک پُرسکون فضا میں بحث و تمحیص ہوسکے۔ میں اس خط کی ایک نقل آپ کے بمبئی کے پتہ پر بھی بھیج رہا ہوں۔"

یہ خط سر سکندر حیات کے ایماء پر لکھا گیا تھا۔ ۲۰ مارچ کو دہلی میں مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں پنجاب کے نمائندوں (ملک برکت علی، غلام رسول خان، ملک زمان مہدی اور عاشق حسین بٹالوی) نے محمد علی جناح سے لاہور میں مجوزہ لیگ کے اجلاس کے بارے میں پوچھا تو اُنہوں نے مُسکرا کر نواب ممدوٹ کا خط اُن کے سامنے رکھ دیا تو ان اصحاب کے لئے سوائے خاموشی کے چارۂ کار نہ رہا۔ ۲۰ مارچ کے اجلاس میں ہی یہ فیصلہ کر دیا گیا کہ مسجد شہید گنج کے بارے میں مسلم لیگ کا خصوصی اجلاس کلکتہ میں ہوگا۔ اس اجلاس میں پانچ ارکان کی ایک ذیلی کمیٹی مقرر کی گئی جس کے صدر نواب اسمٰعیل خان اور سیکرٹری لیاقت علی خان تھے۔ اس کمیٹی نے مختلف صوبوں کی مسلم لیگوں کی الحاق کی درخواستوں پر غور کرنا تھا۔ پنجاب مسلم لیگ نے اگرچہ ۱۱ مارچ کو ایسی درخواست دیدی تھی، پھر بھی یہ افواہ گرم تھی کہ اسے پذیرائی نہیں بخشی گئی اور فی الواقعہ ایسا ہی ہوا کیونکہ ۱۵ اپریل کو لیاقت علی خان نے پنجاب مسلم لیگ کو اس امر کی اطلاع دیدی۔ غلام رسول خاں نے یہ اطلاع حضرت علامہ، ملک برکت علی اور خلیفہ شجاع الدین وغیرہ کو دیدی۔ حضرت علامہ کے لئے یہ ایک زبردست دھچکا تھا کیونکہ انہوں نے لیگ کی تنظیم کے لئے دن رات کام کیا تھا۔ ۷ مارچ ۱۹۳۸ء کو ہی تو انہوں نے یہ فرمایا تھا[1]

---

[1] :- اقبال کے حضور نشستیں اور گفتگوئیں جز اول صہ ۲۹۷ - ۲۹۸

"سرِ دست ایک ہی صورت ہے، مسلمانوں کو چاہیئے جناح کے ہاتھ مضبوط کریں۔ لیگ میں شامل ہو جائیں۔ ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ ہے اب جس طرح حل کیا جا رہا ہے اس میں ہمارا متحدہ محاذ ہی انگریزوں اور ہندوؤں کی مخالفانہ کارروائیوں کا واحد جواب ہے۔ بغیر اس کے ہم اپنے مطالبات کیسے منوا سکتے ہیں، لوگ کہتے ہیں ان مطالبات سے فرقہ داری کی بُو آتی ہے۔ یہ محض پروپیگنڈا ہے ان مطالبات کا تعلق ہمارے قومی وجود کے تحفظ سے ہے"

پھر فرمایا :۔ "لیگ کامیاب ہو گی تو جناح کے سہارے۔ جناح کے سوا کوئی شخص مسلمانوں کی قیادت کا اہل نہیں۔"

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت علامہ لیگ اور محمد علی جناح کے درمیان کوئی فرق روا نہ رکھتے تھے لیکن انہیں پہلے سر فضل حسین اور بعد میں سر سکندر حیات کے علاوہ برطانوی ظالم اور عیار گماشتوں کا بھی سامنا تھا۔ حضرت علامہ ان کی پروا نہیں کرتے تھے لیکن کسی قسم کے تغافل یا لاپرواہی کے بھی قائل نہ تھے وہ تنقیض اور مقصد کی برتری کے حصول کے لئے کوشاں رہے۔ کئی مواقع پر خود محمد علی جناح نے بھی حضرت علامہ کی ان خدمات کا اعتراف کیا۔ انہوں نے ایک دفعہ لکھا :۔

"یہ مسلم لیگ کے لئے عظیم کامرانی ہے کہ اس کی قیادت کو اکثریتی اور اقلیتی دونوں ہی صوبے تسلیم کرتے ہیں۔ سر محمد اقبال نے اس تحفظ کو حاصل کرنے میں نہایت ہی واضح کردار ادا کیا ہے اگرچہ اُس وقت عوام کو اس کا علم نہیں تھا۔"

بہر حال پنجاب مسلم لیگ کے عہدیداروں کا فوری ردِ عمل یہ تھا کہ وہ احتجاجاً مستعفی ہو جائیں بعد میں یہ فیصلہ تبدیل کر دیا گیا اور جملہ نقائص دور کر کے الحاق کی نئی درخواست فی الفور دہلی بھیجنے کا فیصلہ ہوا۔ ۶ اپریل کو ملک برکت علی نے ایک طویل خط محمد علی جناح کو لکھا جس میں پنجاب لیگ کی خدمات اور مختلف عوامل پر روشنی ڈالی گئی۔ ۱۲ اپریل کو غلام رسول خاں نے کونسل کا اجلاس طلب کیا اور ذیلی کمیٹی کے دونوں اعتراضات رفع کر دیئے۔ اور الحاق کی نئی درخواست دہلی بھیج دی۔ ۱۴ اپریل کو حضرت علامہ نے غلام رسول خاں، ملک برکت علی، خلیفہ شجاع الدین، پیر تاج الدین، ملک زمان مہدی

اور عاشق حسین بٹالوی کو حکم دیا کہ وہ کلکتہ جائیں اور اپنے حق کے لیے لڑیں۔ انہیں اس بات کا سخت قلق تھا کہ درخواست مسترد کر دی گئی۔

چنانچہ یہ اصحاب کلکتہ پہنچے اور درخواست گزاری۔ طویل بحث و تمحیص کے بعد نئی آرگنائزنگ کمیٹی کی فہرست تیار کی گئی جس میں پچیس آدمی سر سکندر حیات کے تھے اور دس دوسرے گروہ کے۔ ان اراکین کے نام یہ تھے:۔

۱۔ سر سکندر حیات خاں۔	صدر
۲۔ نواب سر شاہنواز خاں ممدوٹ	
۳۔ نواب سعادت علی خاں، یونینسٹ ایم ایل اے	
۴۔ ملک خضر حیات خان ٹوانہ	وزیر بلدیات
۵۔ میاں عبدالحئی	وزیر تعلیم
۶۔ میاں احمد یار خان دولتانہ۔	چیف پارلیمانی سیکرٹری
۷۔ سید افضال علی حسنی۔	یونینسٹ ایم ایل اے
۸۔ میاں مشتاق احمد گورمانی۔	پارلیمانی پرائیویٹ سیکرٹری
۹۔ میر مقبول محمود،	پارلیمانی سیکرٹری
۱۰۔ سید امجد علی	پارلیمانی پرائیویٹ سیکرٹری
۱۱۔ میاں غیاث الدین	ایم ایل اے (مرکزی اسمبلی)
۱۲۔ نواب زادہ خورشید علی خاں۔	رکن کونسل آف اسٹیٹ
۱۳۔ سر محمد حیات خاں ٹمن۔	یونینسٹ ایم ایل اے
۱۴۔ راجہ فتح خاں	یونینسٹ ایم ایل اے
۱۵۔ نواب مظفر علی خاں	یونینسٹ ایم ایل اے
۱۶۔ نواب فضل علی	یونینسٹ ایم ایل اے
۱۷۔ راجہ غضنفر علی خان	پارلیمانی سیکرٹری
۱۸۔ کیپٹن سر شیر محمد خاں	ایم ایل اے (مرکزی اسمبلی)
۱۹۔ شیخ کرامت علی	یونینسٹ ایم ایل اے
۲۰۔ چوہدری محمد یٰسین	یونینسٹ ایم ایل اے

۲۱۔ شیخ صادق حسن۔ امرتسر
۲۲۔ مولانا غلام رسول مہر ایڈیٹر روزنامہ انقلاب
۲۳۔ شیخ فیض محمد۔ پارلیمانی سیکرٹری
۲۴۔ مولوی غلام محی الدین قصوری۔ یونینیسٹ ایم ایل اے
۲۵۔ چوہدری ریاست علی یونینیسٹ ایم ایل اے
۲۶۔ ڈاکٹر علامہ سر محمد اقبال
۲۷۔ ملک زمان مہدی خاں
۲۸۔ خلیفہ شجاع الدین
۲۹۔ غلام رسول خاں
۳۰۔ ملک برکت علی
۳۱۔ پیر تاج الدین
۳۲۔ مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش۔ ایڈیٹر روزنامہ احسان
۳۳۔ مولانا ظفر علی خان
۳۴۔ میاں عبدالعزیز بیرسٹر ایٹ لا
۳۵۔ عاشق حسین بٹالوی

حضرت علامہ کا بھیجا ہوا وفد ۲۱ اپریل کو لاہور واپس پہنچا۔ اسی صبح اُن کی رُوح قفس عنصری سے نکل کر مالکِ حقیقی کے حضور سربسجود ہو چکی تھی۔

اِنَّ لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۝

اُن کی وفات حسرت آیات پر محمد علی جناح نے فرمایا:

"میرے لئے وہ دوست، رہنما اور فلاسفر تھے۔ اور مسلم لیگ کے نازک لمحات میں وہ ایک چٹان کی طرح ایستادہ تھے اور ایک لمحہ کے لئے بھی اپنی جگہ سے ہرگز نہ ہٹے۔"

حضرت علامہ نہایت نازک حالات میں بھی ایک چٹان کی طرح ایستادہ تھے انہوں نے سیاست پر نظر ڈالی اور فوراً اس نتیجہ پر پہنچے کہ مسلمان رُوحِ اسلام سے ہی رہنمائی حاصل کر کے زندہ رہ سکتے ہیں ان کا سیاسی فلسفہ رہنمائی کے لئے قرآن

پاک کی طرف رجوع کرتا تھا جس نے اسلامی معاشرے کے لئے قواعد و ضوابط م
کر رکھے ہیں۔ اسلام اور قرآن کا مطالعہ اُن کا محبوب مشغلہ تھا۔ ایک دفعہ فرمایا
"سیاست سے میری دلچسپی بھی اسی وجہ سے ہے کہ آج کل ہندوستان کے اندر
تصورات جو شکل اختیار کر رہے ہیں، وہ آگے چل کر اسلام کی ابتدائی ساخت
فطرت پر غالباً اثر انداز ہوں گے۔" ان کا فرمان تھا کہ "سیاست کی جڑ انسان
روحانی زندگی میں ہوتی ہے" اور یہ کہ "افراد اور اقوام کی زندگی میں مذہب ایک
نہایت اہم جزو ہے۔"

گوئٹے کی مثل حضرت علامہ سیاستدانوں ایسی شور و شغب والی زندگی
خواہاں نہ تھے۔ لیکن مسلم معاشرے کے مصلح کا کردار ادا کرنے کا عزم صمیم کرنے
بعد وہ مختلف تحاریک میں حصہ لینے سے باز نہ رہ سکے۔ ۱۹۲۰ء اور ۱۹۳۰ء کے آ
میں آئینی تشکیل میں حصہ لینے کے علاوہ گول میز کانفرنس میں شرکت کی اور ملک
اندر کئی مسلم کانفرنسوں کی صدارت کی۔ انہوں نے مسلمانوں کو بہترین قیادت او
صائب رائے دی۔ مخالفین نے اُنہیں فرقہ پرست کہا لیکن یہ سراسر بہتانِ عظیم
وہ اسلام کے وسیلہ سے انسان کی خدمت پر یقین رکھتے تھے۔ اُن کے نزدیک
ہمہ اسلامیت کوئی سیاسی نظریہ نہیں تھا بلکہ روحانی اساس پر بنی نوع انسان کی
وحدت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مذہب اور سیاست میں کوئی تفریق نہیں کرتے تھے
اُن کا مذہب ہر لحاظ سے جامع تھا۔

اُنہوں نے زندگی کے اس حصے کا آغاز سیاستدان اور محب الوطن کی
حیثیت سے کیا۔ لیکن مُلک کے ساتھ محبت اُس رُوح کی بھوک کو مٹانے کے لئے
کافی نہ تھی کیونکہ وہ وطن کے ساتھ محبت کرتے تھے اور اُن کی رُوح قربانی دینا
بھی جانتی تھی۔

حضرت علامہ کو سیاست اور وطن کے مسائل سے خاص لگاؤ تھا، مگر وہ ایک
تنگ نظر سیاستدان نہیں تھے۔ آزادی کو وہ انسانیت کے ارتقاء کے لئے سب سے
ضروری سمجھتے تھے۔ کیونکہ غلامی انسان کی بہت سی خداداد صلاحیتوں کو فنا کر دیتی

اور بہت سی خوبیوں کو مٹا دیتی ہے ؎

آزادی کی ایک آن ہے محکوم کا اِک سال
کس درجہ گراں سیر ہیں محکوم کے اوقات

آزادی ہی کی حالت میں انسان کی تمام ذہنی و عملی قوتوں کا نشو و نما اور بہت سی مخفی قوتوں اور پوشیدہ کمالات کا انکشاف ممکن ہے ؎

بندگی میں گھٹ کے رہجاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی

پھر فرمایا ؎

خواب سے بیدار ہوتا ہے کبھی محکوم اگر
پھر سُلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

حضرت علامہ ایک راست گو سیاستدان تھے اور سیاست کی عیاریوں، جنہیں "فن"
ا جاتا ہے، کو برا سمجھتے تھے ؎

اگر کوئی مدبر ہے تو سُن میری صدا — ہے، میری دستِ اربابِ سیاست کا عصا
ِن مطلب سے جھجک جانا نہیں زیبا تجھے — نیک ہے نیت اگر تیری تو کیا پروا تجھے
ِہ مومن کا دل بیم و رجا سے پاک ہے — قوت فرمانروا کے سامنے بے باک ہے

حضرت علامہ کی زندگی میں جموں و کشمیر متحدہ ہندوستان کی ایک ریاست کا
تہ تھے۔ اُن کا اپنا تعلق بھی خطۂ کشمیر سے ہے۔ انہوں نے اردو اور فارسی شاعری میں
باب، سندھ، سرحد اور بلوچستان کے علاوہ کشمیری کاشتکاروں کا ذکر بھی کیا ہے
یری زمیندار بھی دست بستہ مظلوموں کی صف میں کھڑے ہیں۔ ان کا ایک شعر ملاحظہ
ئیں ؎

کہہ رہا ہے داستان بے دردیٔ ایام کی
کوہ کے دامن میں غم خانۂ دہقانِ پیر

حکیم الامت نے اہل پنجاب کو مسلم لیگ کے پرچم تلے جمع ہونے کے لئے سخت

تگ ودو کی۔ وہ مخالفین کی چالوں کو ناکام بنانے کے گُر بھی جانتے تھے۔ خرابی صحت کی بنا پر وہ پارلیمانی بورڈ کے صدر کی حیثیت سے ہر اجلاس میں شرکت نہ کر سکتے تھے انہوں نے اپنی جگہ زمان مہدی خاں کو صدر منتخب کر لینے کی خواہش کا اظہار کیا۔ حضرت علامہؒ اُن کی قابلیت اور خلوص کے بڑے مداح تھے۔ بورڈ کے اراکین کی خواہش تھی کہ زمان مہدی خاں کو نائب صدر منتخب کر لیا جائے تاکہ حضرت علامہ کے استعفیٰ سے کوئی خلا پیدا نہ ہونے پائے۔ لیکن حضرت علامہؒ اس تجویز سے متفق نہ ہوئے اور وعدہ کیا کہ وہ بورڈ کی رکنیت سے مستعفی نہ ہوں گے، اور اپنا استعفیٰ لکھ کر غلام رسول خاں کے حوالے کر دیا تاکہ وہ بورڈ کے اجلاس میں اسے پیش کر سکیں۔

یہ خبر غلام رسول خاں کے ایجنڈا جاری کرنے کی وجہ سے یونینسٹ پارٹی کے دفتر میں پہنچ گئی یہ دفتر ممدوٹ ولا میں قائم کیا گیا تھا۔ وہاں کے لوگ مارے خوشی کے بغلیں بجانے لگے کہ حضرت علامہ کے استعفیٰ سے مسلم لیگ کا جنازہ نکل جائے گا۔ یونینسٹ پارٹی کے ہم خیال اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ نے اس خبر کو اور اپنے خیال میں پیدا ہونے والے نتائج کی تصویر میں خوب گلکاری کی۔

حضرت علامہؒ نے خبر پڑھ کر غلام رسول خاں کو ہدایت کی کہ وہ ۱۲ اگست والے اجلاس میں اُن کا استعفیٰ پیش نہ کریں اور پھر تحریری طور پر اپنا استعفیٰ واپس لے لیا اور اس کے ساتھ ہی پنجاب کے ساٹھ ممتاز افراد کی فہرست تیار کر کے غلام رسول خاں کو دی اور فرمایا کہ ان افراد کو بورڈ میں شامل کر لیا جائے۔ اس طرح یونینسٹ پارٹی کے صدر دفتر میں مایوسی کی صفِ ماتم بچھ گئی۔

حکیم الاُمّت کی حیات میں ہی لوگوں نے یوم اقبال منانا شروع کر دیا تھا۔ ۲۶ دسمبر ۱۹۳۷ء کو انٹر کالجیٹ مُسلم برادرہڈ کے زیر اہتمام لاہور میں ایسی ہی تقریب کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اس موقع پر سر سکندر حیات نے درج ذیل بیان اخبارات میں اشاعت کی غرض سے جاری کیا [1]

---

[1] Civil and Military Gazette, Lahore, 5.12.1937.

"یوم اقبال کو ایک مقدّس قومی تقریب کے طور پر منائے جانے پر ہر ہندوستانی کو بالعموم اور ہر پنجابی کو بالخصوص سچے دل سے خوش ہونا چاہیئے میری دلی تمنا ہے کہ اس یادگار تہوار کی مسرتیں، جو ایشیا کے نامور فلسفی اور عظیم المرتبت شاعر کے نام سے منسوب ہیں، صرف ہندوستان تک محدُود نہیں رہنی چاہئیں بلکہ تمام مشرقی ممالک کو اُن میں شریک ہونا چاہیئے۔ ہمارا فرض ہے کہ اس تقریب کو اس متانت، سنجیدگی اور وقار سے منائیں جس سے ایک طرف تو دُنیا پر اقبال کی عظمت اور اُس کی شاعری کی حقیقی قدر و منزلت ظاہر ہو جائے۔ اور دوسری طرف یہ بھی واضح ہو کہ ایشیا اپنے اس فرزند جلیل کے ادبی کارناموں کی قدر کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔

"عرصہ دراز کی گراں خوابی کے بعد اگر آج ہمیں مسلمانوں میں بیداری کے آثار نظر آ رہے ہیں تو یہ سب کچھ اقبال کی پُر جوش آواز کا اثر ہے۔ ادھر ہندوستان کے باشندوں میں بھی جو تڑپ اور بلند نگہی پیدا ہو رہی ہے وہ بھی اس نابغۂ عظیم کی مساعی کی شرمندۂ احسانی ہے۔ لہٰذا ہر ہندوستانی کا فرض ہے کہ یومِ اقبال کو ایک مقدّس قومی فریضہ سمجھ کر اس میں سرگرمی سے حصّہ لے۔

"میں اس سلسلہ میں یہ تجویز پیش کرتا ہوں کہ جس جس شہر میں یوم اقبال منایا جائے وہاں کے باشندوں کو چاہیئے کہ شاعرِ اعظم کی خدمت میں ایک تھیلی نذر کریں اس تجویز پر عمل کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اقبال کمیٹی کو چاہیئے کہ امپیریل بنک آف انڈیا میں یوم اقبال فنڈ کے نام سے حساب کھولدے۔ اقبال کے نیاز مندوں اور اُن کی شاعری کے مداّحوں کا فرض ہے کہ جُملہ رقوم براہِ راست بنک کو ارسال کریں، جو انجام کار ہمارے محبُوب شاعر کی خدمت میں پیش کی جائیں گی۔

علاوہ ازیں میں یہ بھی درخواست کرتا ہوں کہ تمام مساجد اور مندروں میں اقبال کی صحت اور درازیٔ عمر کے لئے دعائیں مانگی جائیں کہ خدائے تعالیٰ اُنہیں عرصہ دراز تک سلامت رکھے تاکہ وہ اپنی قوم اور ملک کی خدمت کر سکیں۔"

حضرت علامہ اپنی ذات سے بلند و بالا ہو کر سوچتے تھے۔ اُن کے لئے ملّت اسلامیہ کا مفاد زیادہ عزیز تھا اور یہ مقصد مسلمانوں کو جدید علُوم کے زیور سے آراستہ کر کے ہی حاصل ہو سکتا تھا۔ چنانچہ سر سکندر حیات کی تجویز کے جواب میں اُنہوں نے درج ذیل بیان اشاعت کے لئے دیا[1]

"سر سکندر حیات خان نے انٹر کالجیٹ مسلم برادر ہڈ کے نام جو پیغام دیا ہے اس میں انہوں نے میرے متعلق بہت سے محبت آمیز جذبات کا اظہار فرمایا ہے میں اُن کا بے حد ممنون ہوں۔"

"سر سکندر نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ جو لوگ میرے کلام سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ سب مِل کر مجھ کو ایک تھیلی پیش کریں۔ میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ حالات میں ہماری قوم کی ضروریات اس قدر زیادہ ہیں کہ اُن کے سامنے ایک شخص کی ضروریات کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ ہر چند کہ اُس شخص کی شاعری نے ہزاروں، لاکھوں انسانوں کی رُوح کو کیوں نہ جِلا بخشی ہو۔ فرد اور اس کی احتیاج بہر حال ختم ہو جانے والی چیز ہے لیکن قوم اور اس کی احتیاج ہمیشہ باقی رہے گی۔"

"آج وقت کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ اسلامی عُلوم کی تحقیق کے لئے لاہور کے اسلامیہ کالج میں ایک چیئر قائم کی جائے جہاں جدید طریقوں کے مطابق ریسرچ ہونی چاہیئے، اسلامی تاریخ، فقہ، دینیات اور تصوف سے جس قدر جہالت پنجاب میں برتی جا رہی اور اس جہالت سے جس قدر فائدہ غرض مند لوگوں نے پنجاب میں اُٹھایا ہے، اس کی مثال ہندوستان میں کہیں نہیں ملتی۔"

"اب وقت آگیا ہے کہ اسلامی فکر اور اسلامی طرز حیات کا بغور مطالعہ کر کے ہم عوام کو بتائیں کہ اسلام کا اصل مقصد کیا تھا۔ اور اس مقصد اور پیغام کو کس طرح تہہ در تہہ پردوں میں چھپا دیا گیا ہے۔ نیز یہ کہ ہندوستان کے اندر موجودہ اسلام کی رُوح کو کیونکر مسخ کیا گیا ہے۔ ان پردوں کو اب اٹھانا چاہیئے تاکہ نئی نسل کے نوجوان اسلام کی حقیقی شکل وصورت سے آگاہ ہو سکیں۔"

"مسلمانوں ہی کے لئے نہیں بلکہ غیر مُسلموں کے لئے بھی یہ ادارہ بے حد مفید ثابت ہوگا۔ کیونکہ اسلام ایک طرف ایشیا کے باشندوں کی زندگی میں ایک زبردست عنصر کی حیثیت سے کارفرما رہا ہے تو دوسری طرف اُس نے نوع انسانی کے ذہنی اور مذہبی انقلاب میں بڑا نمایاں حصّہ لیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میری اس تجویز کو پنجاب کے وزیر اعظم پسند فرمائیں گے اور اپنے اثر ورسوخ سے اسے کامیاب بنانے کی کوشش بھی کریں گے۔ تاہم میں ایک سو روپے کی حقیر رقم اس مجوّزہ فنڈ کی نذر کرتا ہوں۔"

حضرت علامہ نے محمد علی جناح کو تین باتوں پر خاص طور پر زور دیکر کہا تھا:۔

(۱) آئینی تحفظات (۲) سندھ کا پنجاب سے الحاق اور
(۳) شخصی اور دیوانی قوانین کی برقراری۔

۱۹۳۷ء کے انتخابات کی تیاریوں کے سلسلے میں مختلف سیاسی جماعتوں نے اپنے اپنے منشور پیش کئے۔ جب مسلم لیگ نے انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا تو پنڈت نہرو نے کلکتہ میں ایک تقریر کے دوران میں اس بات پر اصرار کیا کہ ہندوستان میں صرف دو جماعتیں ہیں یعنی کانگرس اور برطانوی حکومت۔ باقی جماعتوں کو یا کانگرس کی تقلید کرنی ہوگی یا پھر حکومت کا ساتھ دینا ہوگا۔"

مجبوراً محمد علی جناح کو ببانگ دہل یہ بتانا پڑا کہ تیسرا فریق بھی موجود ہے یعنی مسلمان۔ جو کسی فریق کے کاسہ لیس بننے کی بجائے اپنی قومی حکمت عملی اور اپنا قومی پروگرام رکھتے ہیں۔ اس لئے کانگرس کو اُن کے حلقہ ہائے انتخاب میں مداخلت نہیں کرنی چاہیئے۔

پنڈت نہرو اس توضیح کو برداشت نہ کر سکے اور محمد علی جناح کی ذات پر رکیک حملے کرنے شروع کر دیئے۔ ایک بیان میں اُنہوں نے مسلم لیگی قیادت کو خود غرض تک کہہ دیا جو اسمبلی کی نشستوں اور ملازمتوں کے بٹوارے کے سوا کچھ نہیں جانتی۔

اس موقعہ پر حضرت علامہ نے درج ذیل بیان جاری کیا:۔

"..... میرے دل میں پنڈت نہرو کی بہت عزت ہے۔ انہوں نے آزادئ وطن کی خاطر جو مصائب برداشت کئے اور قربانیاں گوارا کی ہیں میں اُن کی قدر کرتا ہوں۔ لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ انہوں نے بلا وجہ مسٹر جناح کے ساتھ اُلجھنے کی کوشش کی ہے۔ مسٹر جناح آج مسلمانوں کے سب سے بڑے اور سب سے معتمد علیہ قائد ہیں انہوں نے اپنے مُلک کی جو خدمت کی ہے وہ کسی اور قائد سے کم نہیں۔ لیکن مسٹر جناح تخیل کی دُنیا میں پرواز کرنے کی بجائے حقیقت بینی کو ترجیح دیتے ہیں اسی لئے اُن کی قوم پرستی اور حُب الوطنی حقائق و واقعات کے صحیح تجزیے پر مبنی ہے۔

"مسٹر جناح کا آخر قصور کیا ہے جس پر پنڈت نہرو اس قدر طیش میں آ رہے ہیں؟ صرف یہی کہ انہوں نے کلکتہ میں تقریر کرتے ہوئے کانگرس کی اس روش کو غلط قرار دیا تھا کہ وہ مسلمانوں کے حلقوں میں اپنے اُمیدوار کھڑے کر رہی ہے۔ مسٹر جناح اور آل انڈیا مُسلم لیگ اپنے خیالات و عقائد اور مطمحِ نظر کے اعتبار سے کانگرس سے بے حد قریب ہیں اس لئے ہر مسلمان بجا طور پر یہ توقع رکھتا ہے کہ جہاں تک مجالس قانون ساز میں مسلمانوں کے نمائندے بھیجنے کا سوال ہے، کانگرس اس مسئلہ میں دخل نہیں دے گی بلکہ یہ معاملہ کلیتہً مسلم لیگ کی صوابدید سے طے کیا جائے گا۔

"اگر کانگرس مسلمانوں میں بھی اُتنی ہی ہر دلعزیز ہوتی جتنی کہ ہندوؤں میں ہے تو پھر پنڈت نہرو کو یقیناً یہ حق حاصل تھا کہ کانگرسی ٹکٹ پر مسلمان اُمیدوار کھڑے کرتے۔ لیکن یہ ایک اظہر من الشمس اور ناقابل تردید حقیقت ہے کہ ابتداء سے لے کر اب تک صرف گنتی کے چند مسلمانوں نے کانگرس کی شرکت گوارا کی ہے۔ مسلمان عوام ہمیشہ کانگرس سے الگ تھلگ رہے ہیں۔ مسلمانوں کے اس طرزِ عمل سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ وہ خدانخواستہ جذبۂ آزادی سے محروم ہیں۔ بلکہ یہ امر اس بات کا ثبوت ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان بعض بنیادی اختلافات ہیں اور جب تک اُن اختلافات کو باہمی افہام و تفہیم سے رفع نہیں کیا جائے گا مسلمان اور ہندو کانگرس کے پلیٹ فارم پر جمع نہیں ہو سکتے۔

"یہ صحیح ہے کہ مسٹر سی آر داس ایسے فراخ دل انسان نے مسلمانوں کے خدشات کو دُور کرنے کی بڑی قابلِ تحسین کوشش کی تھی۔ لیکن اُن کی وفات کے فوراً بعد پنڈت مالوی اور ڈاکٹر مُونجے کے تعصب نے اُس رواداری کا خاتمہ کر دیا۔ میں یہ بھی تسلیم کرنے کو تیار ہوں کہ پنڈت جواہر لال نہرو واقعی کچھ عرصہ مالوی اور مونجے کی ذہنیت کا مقابلہ کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ لیکن حال ہی میں انہوں فرقہ وارانہ فیصلے کے متعلق کانگرس کی غیر جانبداری کو جس طریقے سے ختم کیا ہے وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ بھی آخرکار مہاسبھا کے روز افزوں اثر سے مغلوب ہو گئے ہیں۔ پنڈت نہرو کے اس طرزِ عمل کو دیکھ کر اب مسلمانوں کو اُن پر بھی چنداں اعتماد نہیں رہا۔

"علاوہ ازیں پنڈت نہرو کو یہ ہرگز زیب نہیں دیتا کہ اس بات کا شور مچاتے پھریں

کہ مسٹر جناح مسلمانوں کے متوسط درجے کے بالائی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں یا مسٹر جناح کو مسلمانوں کے افلاس اور ناقہ زدگی کا کوئی علم نہیں یا یہ کہ وہ (پنڈت نہرو) ہندوؤں اور مسلمانوں کی یکساں نمائندگی کرتے ہیں۔

"میں پوچھتا ہوں کیا خود پنڈت نہرو ہندوؤں کے متوسط درجے کے بالائی اور متمول طبقے سے تعلق نہیں رکھتے؟ افلاس اور بھوک کا نام لے لے کر خلط مبحث کرنے اور ماسکو سے مانگی ہوئی زبان میں باتیں کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا ضرورت اس امر کی ہے کہ حقائق کو بہ نظر غائر پرکھا جائے مسٹر جناح اپنے اس دعویٰ میں بالکل حق بجانب تھے کہ کانگرس کو مسلمانوں کے انتخابی حلقوں میں اپنے اُمیدوار نہیں کھڑے کرنا چاہئیں اس نصیحت سے ناراض ہونے کی بجائے کانگرس کا فرض تھا کہ اس پر عمل پیرا ہوتی۔"

"مجھے اُمید ہے کہ پنڈت نہرو کو جلد اس بات کا احساس ہو جائے گا کہ مسٹر جناح مسلمانوں میں کتنی بلند حیثیت اور ارفع مقام کے مالک ہیں اور اس کے بعد وہ مسٹر جناح کو ناراض کرنے کی بجائے اُن کی امداد و اعانت سے مستفید ہونے کی کوشش کریں گے جیسا کہ مرکزی اسمبلی کے کانگرسی قائد اب تک مستفید ہوتے رہے ہیں۔"

"مسلمانوں کی طرف سے اگر کسی شخص کو بات کرنے کا حق حاصل ہے تو وہ صرف مسٹر جناح ہیں۔ ممکن ہے پنڈت نہرو اس حقیقت کو تسلیم کرنے کی بجائے جنت الاحمقان میں رہنا پسند کریں۔ اور یہ اصرار کئے جائیں کہ مسلمانوں کی نیابت کا حق بھی کانگرس ہی کو حاصل ہے۔ اگر انہوں نے ایسی ضد کی تو خود اپنے ہاتھوں سے ہندوستان کی آزادی کے راستے میں روڑے اٹکائیں گے۔ پنڈت نہرو کو چاہیئے کہ مسٹر جناح سے معذرت کر کے اُس خلیج کو پاٹنے کی کوشش کریں۔ جو اُن کی جلبازی اور ناتجربہ کاری نے پیدا کر دی ہے۔"

حضرت علامہ کی صحت روز بروز گر رہی تھی اُن کی عقیدت مندوں کو سخت فکر دامنگیر رہتی تھی۔ نیرو بی کے مسلمانوں نے اُن کی صحت یابی کے لئے لکھا تو اُنہوں نے فرمایا کہ میری صحت کی فکر نہ کریں اور محمد علی جناح کی درازیٔ عمر کی دعا مانگیں جو مسلمانوں کے واحد قائد ہیں۔

محمد علی جناح یہ نہ چاہتے تھے کہ " مختلف محاذوں پر نبرد آزما ہوں۔ کانگرس ایک قومی نظریئے پر سختی سے ڈٹی ہوئی تھی۔ اس لئے ضروری ہے کہ اندرونی اختلافات ختم کر کے ایک متحدہ محاذ قائم کر لیا جائے۔ لیکن یونینسٹ پارٹی کی گھٹی میں عیاری اور مکاری پڑی ہوئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ سر سکندر حیات اور ان کی جماعت نے مسلم لیگ کے قرطاسِ رکنیت پر دستخط نہ کئے۔ اسی ضمن میں فروری ۱۹۳۸ء میں حضرت علامہ نے غلام رسول خاں سے ذیل کا بیان لکھوا کر اخبارات میں بغرض اشاعت بھجوا دیا۔

" ۱۴ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو آنریبل سر سکندر حیات خاں نے یونینسٹ پارٹی کے قائد کی حیثیت سے آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاس لکھنؤ میں یہ اعلان کیا تھا کہ واپس پنجاب جانے کے بعد وہ اپنی جماعت کا ایک اجلاس منعقد کریں گے اور اس میں اپنی جماعت کے اُن مسلمان اراکین کو جو اُس وقت مسلم لیگ کے رُکن نہیں ہیں لیگ کے دستور پر دستخط کرنے اور اُس کے رُکن کی بننے کی تلقین کریں گے۔ یہ ارکان لیگ کے مرکزی اور صوبائی بورڈوں کے قواعد و ضوابط کے تحت رہیں گے اور اسمبلی کے وہ مسلمان ارکان جو مسلم لیگ کا ٹکٹ قبول کر لیں گے۔ اسمبلی کے اندر مسلم لیگ متصور ہوں گے اور اس مسلم لیگ پارٹی کو اجازت ہوگی کہ لیگ کی پالیسی اور پروگرام کے بنیادی اُصول کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کسی اور پارٹی سے اتحاد کرے یا موجودہ اتحاد کو برقرار رکھے۔"

" نام نہاد سکندر جناح پیکٹ کا اہم حصہ صرف یہی ہے اور اس پیکٹ کی باقی شقوں سے ہمیں فی الحال کوئی واسطہ نہیں۔ جب مذکورہ بالا اعلان اخبارات میں شائع ہُوا تو مجھے حقیقتاً بڑی مسرت ہوئی۔ کیونکہ میں محسوس کرتا ہوں کہ یونینسٹ پارٹی کے قیام سے مسلمانوں میں جو انتشار پیدا ہو گیا تھا وہ اب دُور ہو جائے گا۔ اور مسلمان ایک متحدہ قوم بن جائیں گے۔ لہٰذا میں نے مسٹر غلام رسول خاں سیکرٹری پنجاب صوبائی مسلم لیگ کو ہدایت کی وہ سر سکندر کے پاس لیگ کی نوّے درخواست ہائے رکنیت بھیج دیں تاکہ وہ اُن پر یونینسٹ پارٹی کے مسلمان اراکین سے دستخط کروا لیں۔ چنانچہ

یہ درخواستیں اکتوبر ۱۹۳۷ء کے تیسرے ہفتے میں سر سکندر حیات کے پاس بھیج دی گئی تھیں۔ لیکن ہمیں ان کے متعلق کوئی جواب موصول نہ ہوا۔ اس لئے یاددہانی کرائی گئی مگر پھر بھی مُہرِ سکوت نہ ٹوٹی۔ اور تا حال سر سکندر نے ایک درخواست بھی دستخط کروا کر واپس نہیں بھیجی۔ مجھے ملک برکت علی نے اطلاع دی ہے کہ ۳۰ جنوری ۱۹۳۸ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاس دہلی میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا تھا۔ اور وہاں یونینسٹ پارٹی کے ایک ذمہ دار رُکن نے یہ بیان کیا کہ رُکنیت کی درخواستوں پر مسلم ارکان کے دستخط حاصل کر لئے گئے ہیں اور دستخط کرنے والوں نے یہ عہد کیا ہے کہ وہ سکندر جناح پیکٹ کے مطابق لیگ کے رکن بننے پر آمادہ ہیں۔

اس مقام پر یہ امر اشد ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اصل صورتِ حال کو واضح کر دیا جائے۔ سر سکندر کا دعویٰ ہے کہ تحریری معاہدے کے علاوہ جس کا اہم ترین حصّہ اوپر نقل کیا جا چکا ہے اُن کے اور مسٹر جناح کے درمیان زبانی افہام و تفہیم بھی ہوئی تھی۔"

"ملک برکت علی ایم ایل اے نے مجھے بتایا ہے کہ جب مسلم لیگ کونسل کے جلسے میں بحث ہوئی تھی تو مسٹر جناح کی توجہ سر سکندر کے اس دعویٰ کی طرف بھی منعطف کرائی گئی تھی۔ مسٹر جناح نے صاف کہا کہ سکندر جناح پیکٹ کے متن کے علاوہ سر سکندر سے اُن کی کوئی زبانی افہام و تفہیم نہیں ہوئی۔

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس پیکٹ کی مختلف تاویلات کی گئی ہیں اور اس وجہ سے عوام میں یونینسٹ پارٹی کے رویّے کے خلاف سخت ہیجان پیدا ہو گیا ہے۔ پورے چار ماہ گذر چکے ہیں مگر یہ ہیجان و اضطراب کم ہونے کی بجائے روز بروز بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ مسلمان عوام کو صحیح صورتِ حال سے آگاہ کر دیا جائے۔

"میں اعلان کرتا ہوں کہ معاہدہ لکھنؤ کو بالائے طاق رکھ دیا گیا ہے اور اُسے عملی جامہ پہنانے کے لئے ابھی تک کوئی اقدام نہیں کیا گیا۔ اس لئے میں یہ بیان شائع کر رہا ہوں تاکہ مسلمانانِ پنجاب کو معلوم ہو جائے کہ یونینسٹ پارٹی اور مسلم لیگ ایک دوسرے سے علیٰحدہ ہو چکے ہیں۔ اور اب یہ توقع رکھنا کہ سکندر جناح پیکٹ کے بعد یونینسٹ پارٹی کے مسلمان ارکان اپنے آپ کو مسلم لیگ کا دروازہ ہر اُس مسلمان کے لئے کھلا ہے جو لیگ کے دستور پر دستخط کرنے کو تیار ہے اور میں نہایت خوشی

سے اعلان کرتا ہوں کہ اس وقت تک اسمبلی کے متعدد مسلمان ارکان نے لیگ کے دستور پر دستخط کر دیئے ہیں۔"

حضرت علامہ نے مسلم لیگ کو مضبوط بنانے کے لئے مختلف متمول افراد سے عطیات دینے کے لئے بھی کہا۔ لیگ کے مقاصد و اغراض کی تشہیر کے لئے صرف احسان ہی تھا۔ حضرت علامہ کے ایماء پر ملک برکت علی نے اپنی جیب سے دس ہزار روپیہ دیا۔ اس طرح ہفت روزہ اخبار نیو ٹائمز جاری ہوا۔ اس اخبار نے انگریزی خواں طبقے کو مسلم لیگ کے مقاصد سے روشناس کرانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ۱۹۳۸ء میں اس کی سالگرہ کے موقع پر حضرت علامہ نے درج ذیل بیان دیا:۔

"گذشتہ ایک سال میں نیو ٹائمز نے قوم کی جو گراں بہا خدمات انجام دی ہیں میں اُن کو بڑے اطمینان اور مسرت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں اور تمام مسلمانوں سے درخواست کرتا ہوں کہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں اس اخبار کے خریدار بنیں تاکہ نیو ٹائمز ہندوستان کے مسلمانوں کے ایک ذمہ دار اور باوقار ترجمان کی حیثیت اختیار کرے۔"

بدقسمتی سے یہ اخبار صرف سوا دو برس (یعنی ۱۹۳۹ء کے اوائل تک) جاری رہا اور مستقل خسارے کی وجہ سے بند کر دینا پڑا۔

حضرت علامہ وسیع المشرب ہونے کے ناطے اپنے آپ کو دنیا کا شہری خیال کرتے تھے۔ وہ کبھی اس امر کی اجازت نہ دیتے تھے کہ اُن کے اور اُن کے دوستوں کے درمیان سیاسی اختلافات پیدا ہوں۔

حکیم الاُمت نے اُصولِ سیاست اور طریقِ حکومت کا عمیق مطالعہ کیا اور کم فہم انسانوں کو آگاہ کیا کہ ؎

آ تجھ کو بتاؤں میں تقدیرِ اُمم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل، طاؤس و رباب آخر

فلسفی مشرق نے استبداد کی ہر صورت — ملوکیت اور آمریت کی عُمر بھر مخالفت کی۔ یہ بھی صحیح ہے کہ اُنہوں نے مغرب کے جمہوری نظام کی مخالفت کی کیونکہ ؎

ہے وہی ساز کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

اُنہوں نے اس نظام کی مخالفت محض اس لئے کی کہ وہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں تھے۔ چونکہ مغربی جمہوریت میں انسانوں پر انسانوں کی حکومت ہوتی ہے اس لئے اس میں شرفِ انسانیت اور تکریم آدمیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس میں صرف گِنتے ہیں تولتے نہیں۔ پھر وہ آزادیٔ افکار کو بے راہ روی کا موجب قرار دیتے ہیں ؎

اس قوم میں ہے شوخیٔ اندیشہ خطرناک
جس قوم کے افراد ہوں ہر بند سے آزاد
گو فکرِ خداداد سے روشن ہے زمانہ
آزادیٔ افکار ہے ابلیس کی ایجاد

لیکن حضرت علامہ آزادیٔ افکار کے لئے شرط عائد کرتے ہیں:

آزادیٔ افکار سے ہے ان کی تباہی
رکھتے نہیں جو فکر و تدبر کا طریقہ

پھر فرمایا:-

ہو فکر اگر خام تو آزادیٔ افکار
انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ

حضرت علامہ فطرتاً جمہوریت پسند تھے لیکن اُن کی جمہوریت پر بے مثل شخصیت کا قبضہ ہے۔ اسلام کی جمہوریت کا دفاع کرتے ہوئے انہوں نے ۱۹۱۶ میں The New Er میں لکھا:-

"یورپ کی جمہوریت، جس پر اشتراکی شورش اور نراجی خوف کا سایہ ہے نے یورپی معاشروں کی معاشی اصلاح میں جنم لیا۔ تاہم نطشے، بھیڑ (چال) کی حکومت سے نفرت کرتا ہے اور عوام الناس کی حکومت سے مایوس

لہ:- حضرت علامہ مغربی طرز جمہوریت کو ناپسند فرماتے تھے کہ یہ افراد اور اقوام کو مقصد کے حصول کا ذریعہ خیال کرتی ہے۔

ہو کر وہ سُپرمین کی اشرافیہ کی نشوونما اور فروغ پر اعلیٰ ترین ثقافت کی بنیاد رکھتا ہے۔ لیکن کیا عوام الناس کی حکومت قطعی طور پر مایوس کُن ہے؟ اسلام کی جمہوریت نے معاشی موقع کے پھیلاؤ سے جنم لیا۔ یہ ایک رُوحانی اُصول ہے جس کی بنیاد اس مفروضے پر ہے کہ ہر انسان مخفی طاقت کا مرکز ہے جس کے امکانات کو کردار کی ایک خاص قسم کی نشوونما سے فروغ دیا جاسکتا ہے۔ عامی مواد سے اسلام نے وہ انسان تیار کئے ہیں جن کا تعلق طاقت اور زندگی کی نہایت عمدہ قسم سے ہے۔ تو کیا ابتدائی اسلام کی جمہوریت نطشے کے خیالات کی تجرباتی تردید نہیں ہے؟"

حضرتِ اقبالؒ نے ۱۹۱۰ء کے موسم سرما میں ایم اے او کالج علی گڑھ میں انگریزی زبان میں "اسلامی معاشرتی نظریہ پر ایک نظر"

A Look At The Islamic Social Theory

کے موضوع پر ایک لیکچر دیا۔ ۱۹۳۰ء میں انہوں نے ایک پریس انٹرویو میں یہ تسلیم کیا کہ اُن کے پاس خطبے کے انگریزی متن کی کوئی نقل نہیں ہے۔ اس کا اُردو ترجمہ مئی ۱۹۱۱ء میں مولانا ظفر علی خاں نے شائع کیا۔ دوام میں قومیت کے فرض کے متعلق انہوں نے فرمایا تھا۔

"... کائنات کی لڑکھڑاتی ہوئی حدوں میں اصلی ہدف یقیناً بہت دُور ہے! دوام کو حقیر انسانی مقاصد کے معنوں میں نہیں جانچا جاسکتا۔ قوانینِ فطرت بے رحمانہ اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہیں۔ نہ تو افراد اور نہ ہی اقوام دوام کے عمل کے فہم کے لئے کسوٹی بنائے جاسکتے ہیں ...."

فرد معاشرے کا محض آلہ کار ہے۔

"... جدید حیاتیات نے قطعی طور پر یہ ثابت کردیا ہے کہ 'فرد' محض تصوراتی سرقہ ہے جس کی معاشرے کے وجود کے سیاق و سباق میں باضابطہ داخلیت اب مدت کی ناپائیدار جزے سے بڑھ کر نہیں۔

فرد ایک مفید افسانہ ہے جسے نقدی، گروہ یا معاشرے کے سمجھنے اور توضیح کرنے کے لئے اختیار کیا جاتا ہے۔ انفرادی شعور، انفرادی خواہشات انفرادی ذہنی اور طبعی استعداد، انفرادی تعین، حتیٰ کہ انفرادی وجود کے ایام معکوس طریق عمل سے زیادہ وقعت کے مالک نہیں، جن کے محض جواز کو خواہشات اور اجتماعیت کی ضروریات کے حوالہ سے سمجھا جا سکتا ہے۔ تمام انفرادی سرگرمیاں اجتماعی کاموں کی محض تکمیل ہوتی ہیں۔ جس طرح کسی فرد کے اعضاء اس اُس کی شخصیت کے خودکار آلہ ہوتے ہیں۔ اسی طرح فرد اجتماعی ہئیت کا آلہ کار ہوتا ہے...."

معاشرے جاندار اعضاء ہوتے ہیں:-

"..... تمام انفرادی اعضاء سے بڑھ کر معاشرے کا اپنا نامیاتی وجود ہوتا ہے۔ یہ محض اپنے اراکین کا مجموعہ نہیں ہوتا۔ معاشرے کی موجودہ نسل کے علاوہ اس کی ماضی اور مستقبل کی نسلیں بھی اس کی نامیاتی شخصیت میں "ساختی عناصر" ہیں۔ حیاتیات نے بالآخر ثابت کر دکھایا ہے کہ تمام کامیاب جاندار انواع کی موجودہ نسل کو اپنی مستقبل کی نسلوں کی نشوونما کی خاطر ایک بیج کا کردار ادا کرنا چاہیئے۔ ایک لحاظ سے معاشرے کی وہ نسلیں جو ابھی پیدا نہیں ہوئیں، وہ زیادہ اہم ہیں۔ موجودہ نسل کی نسبت ...... معاشرے پر معاشی، سیاسی یا ثقافتی اعتبار سے نگاہ ڈالیں خود محافظت کی جبلت اجتماعیت میں اتنی ہی زبردست ہے جتنی کہ یہ کسی فرد میں ....."

'رموز بے خودی' میں حضرت علامہ نے فرمایا ؎

فرد را ربطِ جماعت رحمت است — جوہر اُو را کمال از ملت است
ناتوانی با جماعت یار باش — رونقِ ہنگامۂ احرار باش

پھر ارشاد ہوا ؎

فرد و قوم آئینہ یک دیگر اند — سلک و گوہر، کہکشاں و اختر اند
فرد می گیرد ز ملت احترام — ملت از افراد می یابد نظام

تمام افراد کو ایک قوم کی شکل میں آگے بڑھنے کی تلقین خطباتِ اقبال میں بھی پائی جاتی ہے۔

"اب اصل کام کسی ایک انسان کی رہنمائی کا محتاج نہیں۔ بلکہ تمام افراد کے عزائم اور اداروں کے ایک مقصد کے لئے مرتکز ہونے پر موقوف ہے"

اسی لئے ایک ہو جانے پر افراد کو ملّت کا ستارہ قرار دیا ؎

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملّت کے مقدّر کا ستارا

ایک اور شعر ملاحظہ فرمائیں ؎

فردِ قائم ربطِ ملّت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

ایک اور مقام پر فرمایا: ؎

ملّت کے ساتھ رابطہ اُستوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے اُمیدِ بہار رکھ

قومی اتحاد کو شاعرِ مشرق کے نزدیک بڑی اہمیت حاصل ہے اس اتحاد کے بغیر وہ افراد کو کچھ نہیں سمجھتے۔

اپنے فارسی کلام میں فرمایا: ؎

"فرد کی زندگی جماعت کے بغیر کس قدر محدود ہے۔ کون اس حقیقت سے انکار کر سکتا ہے کہ پریشان افراد بکھری ہوئی پھولوں کی پتیاں ہیں۔ لیکن ایک جماعت میں شریک ہو کر وہی چمن بن جاتی ہیں۔"

پھر فرمایا: ؎

فرد از توحید لاہوتی شود — ملّت از توحید جبروتی شود
اصل حق را حجّت و دعویٰ یکے است — خیمہ ہائے ماجدا، دُلہا یکے است

حضرت علامہ کی حیات کا بحیثیت سیاستدان مطالعہ اُس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک اُن کے معاشی نقطۂ نظر کو زیرِ بحث نہ لایا جائے

انہوں نے فرمایا: ؎

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دُنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات

یہیں سے حضرت علامہ نے کہنہ نظامِ معیشت اور طبقاتی کش مکش کا مطالعہ کیا اور اُس کے خلاف بغاوت کی۔ انہوں نے قرآن پاک سے رہنمائی حاصل کی۔ اُن کا خیال تھا کہ اگر اسلام کے معاشی نظام کو عملی جامہ پہنایا جائے تو جدید معاشرہ کے معاشی مسائل کا حل تلاش کیا جاسکتا ہے ؎

باطن الارض اللہ ظاہر است
ہر کہ ایں ظاہر نہ بیند کافر است

حضرت علامہ زمین کا مالک خدا تعالیٰ کو سمجھتے تھے ؎

دِہ خدایا! یہ زمین تیری نہیں، تیری نہیں
تیرے آبا کی نہیں، تیری نہیں، میری نہیں

وہ تمام انسانوں کی آزادی کے ساتھ ان کی مساوات کے بھی حامی تھے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ دولت کی تقسیم منصفانہ ہو تو افلاس کا وجود ناپاک مٹ جائے گا۔ قوم کے معمار کسان اور محنت کش ہوتے ہیں لیکن وہ تو قعرِ مذلت میں پڑے ہوئے ہوں اور سرمایہ دار پوری کائنات پر متصرف نظر آتے ہیں۔

حضرت علامہ کو کسان کی حالت پر رحم آیا تو وہ اُن کی زبان بن گئے اور انہیں پیغام دیتے ہیں ؎

اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دَور کا آغاز ہے

وہ محنت کشوں کو اتنی طاقت بھی نہیں دینا چاہتے کہ وہ ظالم بن جائے اور انتقام پر آمادہ ہو جائیں۔ وہ تو صرف دنیا کا ایسا نظام چاہتے تھے جہاں محنت کشوں کو ان کی محنت کا بہترین معاوضہ ملے۔ کیونکہ اب تک آجر اُن کو اُجرت کی بجائے اسے خیرات سمجھ کر دیتے رہے۔ حضرت علامہ نے واضح الفاظ میں فرمایا کہ ؎

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے
خضر کا پیغام کیا، ہے یہ پیامِ کائنات
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر
شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات

دستِ دولت آفریں کو مزدیوں ملتی رہی — اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں میں زکات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار — انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

حضرت علامہ اشتراکیت کو فاشیت پر ترجیح دیتے ہیں کیونکہ یہ اسلام سے قریب ہے لیکن وہ اس کے فلسفۂ حیات کے سخت مخالف تھے۔ اسی لئے بانیٔ اشتراکیت کارل مارکس کے متعلق فرمایا ؎

وہ کلیم بے تجلّی، وہ مسیح بے صلیب
نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب

اور کبھی یہ کہ ؎

زانکہ حق در باطل او مضمر است
قلب او مومن دماغش کافر است

انہوں نے مارکسیت کا تجزیہ کرتے ہوئے فرمایا ؎

کردہ ام اندر مقاماتش نگہ
لا سلاطین، لا کلیسا، لا الٰہ

لیکن اس کے ساتھ ہی یہ شرط عائد کی کہ اسے پورا کرنے کی صورت میں کامیابی ممکن ہے ؎

در مقام لانیا ساید حیات — سوئے الّا می خرامد کائنات
لا و الّا برگ و ساز اُمتاں — نفیٔ بے اثبات، مرگ اُمتاں

پھر انہوں نے کارل مارکس کے پیروکاروں کو مخاطب کر کے فرمایا ؎

تو کہ طرحِ دیگرے انداختی — دل ز دستور کہن پرداختی
کردۂ کار خداوندان تمام — بگذر از لا، جانب الّا خرام
اے کہ می خواہی نظام عالمے — جستۂ اورا اساس محکمے؟

محض محنت کشوں کو اقتدار دے دینے سے کام نہیں چلے گا کیونکہ ؎

زمامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا
طریقِ کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

پھر اس کا علاج تجویز فرمایا ؎

داستانِ کُہنہ شُستی باب باب
فکر را روشن کن از اُم الکتاب

اور اس کا طریق کار یہ ہے ؎

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلمان اللہ کرے تجھ کو عطا جدّتِ کردار
جو حرفِ قُلِ العَفوِ، میں پوشیدہ ہے اب تک اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

حضرت علامہ نے خواجہ غلام السیّدین کے نام اُن کے ایک استفسار کے جواب میں ۷ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو تحریر فرمایا:۔

"اشتراکیت کے معترف ہر جگہ، روحانیت اور مذہب کے مخالف ہیں اور اس کو افیون تصوّر کرتے ہیں۔ لفظ افیون اس ضمن میں سب سے پہلے کارل مارکس نے استعمال کیا تھا۔ میں مسلمان ہوں اور انشاء اللہ تعالےٰ مسلمان مروں گا۔ میرے نزدیک تاریخ کی مادی تعبیر سراسر غلط ہے۔"

اسی طرح اُنہوں نے سر فرانسس ینگ ہسبنڈ کے نام اپنے ایک مُراسلے میں فرمایا:۔

"میں اسے تسلیم نہیں کرتا کہ روسی فطرتاً لامذہب ہیں۔ اس کے برعکس میرا خیال یہ ہے کہ روسی مرد اور عورتیں شدید مذہبی رُجحانات کے حامل ہیں اور روسی ذہن کی حالیہ منفی کیفیّت غیر معین عرصہ تک قائم نہیں رہ سکے گی کیونکہ انسانی معاشرہ کا کوئی نظام بھی الحاد کی بنیادوں پر اُستوار نہیں ہو سکتا۔ جب روس کے حالات بہتر ہوں گے اور لوگوں کو ٹھنڈے دل سے سوچنے کا موقع ملے گا تو وہ اپنے نظام کی بنیادیں کسی محکم اُصول پر قائم کرنے کے لئے مجبور ہو جائیں گے۔ چونکہ بالشویت جمع خدا بُری حد تک اسلام کے مماثل ہے اس لئے مجھے تعجب نہ ہوگا کہ کچھ وقت گزرنے کے بعد، یا اسلام روس کو نگل لے یا روس اسلام کو۔"